طلوعِ اسلام

نومبر
۱۹۵۴ء

۱۰/

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

چندہ ختم ہونے کا سرخ نشان

طلوعِ اسلام

پوسٹ بکس ۷۳۱۳ کراچی

بدل اشتراک	مُرتّب	قیمت فی پرچہ
سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی)	سعید احمد	دس آنے (پاکستانی)
" : غیر ممالک سے ۲۱ شلنگ		بارہ آنے (ہندوستانی)

نمبر ۱۱	نومبر ۱۹۵۴ء	جلد ۷

فہرست مضامین

لمعات	۴ - ۱۴	اپنا خریداری نمبر تلاش کیجئے۔	۵۸
سردار عبدالرب نشتر کا جواب	۱۵ - ۱۷	عرفات (نظم)	۵۹
ایک موقعہ پھر مل گیا	۱۸	(محترم اسد ملتانی صاحب)	
شرعی قوانین کی تجدید	۱۹ - ۳۴	رفتارِ عالم	۶۰ - ۷۱
(محترم اے ایم انصاری صاحب)		ہمارا اور آپ کا مشترکہ مفاد	۷۲
عجمی مذاہب کا اثر مسلمانوں کے عقائد پر	۳۵ - ۵۸	ابلیس و آدم	۷۳
(خواجہ عباد اللہ اختر صاحب بی۔ اے)		ادارۂ طلوع اسلام کی مطبوعات ایک نظر میں	۷۴

نہایت اہم اعلان: - ادارۂ طلوع اسلام نے اب ڈاکخانہ میں پوسٹ بکس نمبر حاصل کر لیا ہے لہذا آئندہ خط و کتابت کیلئے پتہ یہ ہوگا

یاد رکھئے :- ناظم ادارۂ طلوع اسلام - پوسٹ بکس ۷۳۱۳ - کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

اس میں شبہ نہیں کہ جس طرح انسانی جسم کی پرورش کے لئے غذا کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح قوموں کی زندگی، ان کے بقا اور استحکام کے لئے مادی سامان اور ذرائع کی ضرورت ناگزیر ہوتی ہے اور ان اسباب کی کمی ان کے ضعف کا باعث اور ان کا فقدان ان کی موت کا موجب بن جاتا ہے۔ لیکن قوموں کی زندگی میں سب سے زیادہ خطرناک اور ہلاکت انگیز لمحات وہ ہوتے ہیں جن میں ان پر مایوسی چھا جائے۔ جس طرح تپ دق کے جراثیم انسان کی ہڈیوں کے گودے تک کو جلا کر راکھ بنا دیتے ہیں اور اس کا ہر قدم قبر کی طرف اٹھتا چلا جاتا ہے اسی طرح جب کسی قوم پر ناامیدی طاری ہو جائے تو ہزار مادی سامان اور اسباب کے باوجود وہ قوم دن بدن پستی کی طرف گرتی اور فنا کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ناامیدی کو کفر سے تعبیر کیا ہے، جس سے فرد یا قوم پر زندگی کی خوشگواریاں اور شادابیاں حرام ہو جاتی ہیں اور اس پر تباہی اور بربادی کا جہنم محیط ہو جاتا ہے۔

پاکستان بنا تو یہاں اس مادی سامان اور اسباب کی قلت تھی جو قوموں کی زندگی اور ترقی کے لئے ازبس ضروری ہوا کرتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مسلمانانِ پاکستان حالات کی ناسازگاری کا نہایت عزم، استقلال اور خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے گئے۔ اس لئے کہ پاکستان ان کی امیدوں کا مرکز، ان کی آرزوؤں کا محور، ان کے شاداب تصورات کی آماجگاہ اور ان کے حسین خوابوں کی محسوس تعبیر تھی۔ وہ ان امیدوں کے آسرے جیتے اور آگے بڑھتے گئے، لیکن شومئی قسمت سے ان کے ارباب حل و عقد ان کے لئے ایسے حالات پیدا کرتے گئے جن سے ان کی امیدوں کے دیئے بجھتے اور ان کی آرزوؤں کی شمعیں خاموش ہوتی چلی گئیں۔ ان کی یہ افسردگیاں اور پژمردگیاں رفتہ رفتہ بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ تا آنکہ ۱۹۵۳ء کے شروع میں یہ اپنی انتہا تک پہنچ گئیں۔ یہ اس زمانہ کا واقعہ ہے جب خواجہ ناظم الدین صاحب کی منحوس وزارت سینۂ ملت پر کابوس کی طرح سوار تھی جس سے قوم کا دم گھٹتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ اس مصیبت سے نجات کس طرح حاصل ہو۔ مایوسی درحقیقت بے چارگی کی پیداوار ہوتی ہے۔ یعنی جب انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ پیش نظر مصیبت کا میرے پاس کوئی حل نہیں تو اس کی اس بے بسی کا احساس ناامیدی بن جاتا ہے اور وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بے ساختہ کہہ اٹھتا تھا کہ — غم ہستی کا جز مرگ کوئی علاج نہیں — چونکہ قوم کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ اس وزارت اور اس کی لائی ہوئی تباہیوں سے کس طرح چھٹکارا حاصل کیا جائے اس لئے وہ بالکل مایوس ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ ملک میں چاروں طرف سے آہوں اور سسکیوں کی جگر پاش آوازیں آتی تھیں اور کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔

بے بسی اور مایوسی کی اس انتہائی شدت میں پاکستان کے گورنر جنرل محترم غلام محمد صاحب نے ایک نعرۂ مستانہ سے کام لیا۔ اور صحیح قلندرانہ جوش سے ناظم الدین وزارت کو الگ کر دیا۔ ملت کے سینہ سے کابوس اُتر گیا۔ اور اس نے پھر سے زندگی کا سانس لینا شروع کر دیا۔ دبی ہوئی امیدیں پھر سے اُبھر آئیں اور بجھی ہوئی آرزوئیں دوبارہ چمک اُٹھیں۔ محترم گورنر جنرل کا یہ فیصلہ بڑا ہی مبارک اور یہ اقدام نہایت خوش کن تھا۔ طلوع اسلام نے ان کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کیا، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی عرض کیا کہ وزارت کی تبدیلی ایک ہنگامی تدبیر ضرور ہے، لیکن قوم کے دُکھ کا مستقل علاج نہیں۔ "جب تک ہمارا موجودہ غیر قرآنی نظام نہیں بدلتا ان کی ہزار مقدس آرزوئیں اور اُن کے رفقائے کار کی پُرخلوص کوششیں کبھی وہ نتائج برآمد نہیں کر سکتیں جنہیں دیکھنے کے لئے انہوں نے ایسا عزیمانہ قدم اٹھایا ہے۔" (طلوع اسلام بابت مئی ۱۹۵۳ء صفحہ ۱۱) اس کا علاج ہم نے یہ بتایا تھا کہ

> جس جست سے آپ نے ابھی ابھی سب "قصے تمام" کر دیئے ہیں اسی قسم کی "عشق کی ایک جست" کی ابھی اور ضرورت ہے۔ اس وقت تک قانون سازی کے سلسلہ میں جو کچھ ہماری مجلس قانون ساز نے کیا ہے غلط راستوں پر کیا ہے ..... نتیجہ اس کا یہ ہے کہ قرآنی آئین تو خیر بہت دور کی چیز ہے، جو کچھ دوسری قومیں تنہا فکرِ انسانی کی مدد سے مرتب کر لیتی ہیں ہمارے ہاں اتنا بھی نہیں ہو سکا۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ جو کچھ اس وقت تک ہوا ہے اس پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا جائے۔ ملک سے ایسے اربابِ فکر و نظر کو اکٹھا کر لیا جائے جو یہ بتا سکیں کہ دورِ حاضرہ کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے قرآن کون کون سے اصول دیتا ہے۔ اور ان اصولوں کی روشنی میں فکرِ انسانی کے مطابق اپنا آئین مرتب کر لیا جائے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس طرح قرآنی اصولوں کی روشنی میں ایک ایسا نظام قائم ہو جائے گا جس کی تلاش میں اس وقت انسانیت ماری ماری پھر رہی ہے۔ اس نظام سے پاکستان کو اقوامِ عالم کی امامت مل سکتی ہے۔ آپ اگر یہ کام کر گئے تو جریدۂ عالم پر آپ کا دوام ثبت ہو جائے گا۔ (طلوع اسلام بابت مئی ۱۹۵۳ء صفحہ ۱۲-۱۱)

لیکن افسوس کہ ہماری اس گذارش کو اُس وقت درخورِ اعتنا نہ سمجھا گیا اور محض وزارت بدلنے سے یہ خیال کر لیا گیا کہ اس سے ملت کے تمام دکھوں کا علاج ہو جائے گا۔ لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، وہ محض ایک ہنگامی تبدیلی تھی، مستقل علاج نہیں تھا۔ چنانچہ ہوا یہ کہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد پھر امیدیں مایوسیوں میں بدلنی شروع ہو گئیں اور قوم میں پھر وہی بے بسی کا احساس اُبھرنے لگا۔ جوں جوں غلط بنیادوں پر اُٹھی ہوئی مجلس آئین ساز اپنی غلط کوششوں میں آگے بڑھتی جاتی تھی، ملک میں زندگی کی امیدیں کم ہوتی جاتی تھیں۔ لیکن اس دفعہ یہ دیکھا گیا کہ اس کے ساتھ ہی ایک عجیب قسم کا اضطراب اور نمایاں انداز کی بے چینی بھی پیدا ہوتی جا رہی تھی جو بعض حساس قلوب کے نزدیک بہت اچھے آثار تھے اور اس سے ان کی امیدیں بندھتی تھیں کہ اگر ہوائے مُراد کشتی کو جانبِ منزل نہیں لا سکی تو شاید یہ طغیانیاں ہی اسے ساحلِ مقصود پر پھینک دیں۔ نا امیدی اور بے چینی کے یہ ملے جُلے جذبات تیز تر ہوتے چلے جا رہے تھے تا آنکہ گذشتہ ستمبر میں مجلس آئین ساز نے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ کو منظور کر کے اس کیفیت کو شدت تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد اس نے پروڈا اور گورنر جنرل کے اختیارات کے متعلق وہ کچھ کیا اور اس انداز سے کیا کہ جس نے محترم وزیرِ اعظم کے الفاظ میں) ملک میں غم و غصہ کا طوفان

برپا کر دیا ہے اور لوگوں کا اعتماد یکسر کھو دیا ہے۔" جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے ان حالات سے ملک میں ایک عجیب قسم کی مایوسی، پریشانی انتشار، عدمِ سکون اور بے دلی کی کیفیت پیدا ہو چکی تھی۔ بایں اس مرتبہ پھر محترم غلام محمد صاحب کی ہمتِ بلند اور عزمِ صمیم نے کام کیا اور کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کے کابوس کو ملت کے سینہ سے اتار کر اسے پھر سانس لینے کے قابل بنا دیا۔ یہ فیصلہ حال ہی میں صادر ہوا ہے (اور چونکہ طلوعِ اسلام کی تاریخ اشاعت بہت نزدیک آ رہی ہے اس لئے) ہم اس کا انتظار نہیں کر سکتے کہ اس فیصلہ پر ملک کے تفصیلی ردِ عمل کا جائزہ لے کر کچھ کہیں۔ لیکن ملک پر جو کیفیت طاری ہو چکی تھی اس کے پیشِ نظر ہمیں یقین ہے کہ اس فیصلہ کا اس سے بھی زیادہ گرم جوشی سے استقبال کیا جائے گا جس والہانہ گرم جوشی سے قوم نے ناظم الدین وزارت کی برطرفی کے فیصلہ کا استقبال کیا تھا۔ اس سے پھر قوم کے ولولے بیدار ہو گئے ہیں۔ پھر اس کی امیدوں میں چمک آ گئی ہے۔ پھر اس کی آرزوؤں میں حرارت پیدا ہو گئی ہے۔ پھر اسے جینے کا آسرا مل گیا ہے۔ پھر اسے موقعہ مل گیا ہے کہ وہ اپنے تصورات کے مطابق اپنی دنیا آپ پیدا کرے اور اپنے اور اپنی آنے والی نسلوں کے لئے وہ راستہ متعین کر لے جو اسے صحیح جنتی معاشرہ کی طرف لے جائے۔ جس قوم پر مایوسی اور مردنی چھا جاتی ہے اس کے لئے پھر سے زندگی اور حرارت کے مواقع بہم پہنچا دینا اعجازِ مسیحائی ہے۔ اس کے لئے ہم ملتِ پاکستانیہ کی طرف سے محترم غلام محمد صاحب کی خدمت میں دلی ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتے ہیں۔ وَكَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا۔

لیکن جس طرح ہم نے پچھلے موقعہ پر ہدیۂ تہنیت پیش کرنے کے ساتھ ہی یہ گذارش کیا تھا کہ محترم گورنر جنرل صاحب کا وہ اقدام ایک ہنگامی تبدیلی ہے۔ ملت کے ناسور کا مستقل علاج نہیں ہے۔ اسی طرح ہم اس مرتبہ بھی عرض کریں گے کہ محترم گورنر جنرل صاحب کا یہ اقدام صرف وہ تخریبی اقدام ہے جو ہر تعمیرِ نو کے لئے ناگزیر ہوا کرتا ہے۔ تعمیری اقدام اس سے آگے چل کر آئے گا۔ جس طرح خواجہ ناظم الدین صاحب کی وزارت کے اشخاص بدل دینے سے کوئی تعمیری کام نہیں ہو گیا تھا اسی طرح کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کے موجودہ ارکان کی جگہ نئے ارکان لے آنا ہمیں منزلِ مقصود تک نہیں لیجا سکتا۔ یہ مقصد اس صورت میں حاصل ہو گا جب ہم پہلے ان تمام خرابیوں کا ازالہ کر لیں جن کی وجہ سے اس برطرف شدہ مجلسِ دستور ساز نے اتنا وقت بھی ضائع کیا اور قوم کے لئے ایسی تباہیوں کے سامان بھی پیدا کر دیئے۔ رومی نے کہا ہے کہ

ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند　　اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

ہماری کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی غلط بنیادوں پر اٹھی ہوئی عمارت تھی۔ محترم گورنر جنرل کی ہمتِ بازو نے اس عمارت کو تو گرا دیا لیکن اگر ہم نے ان بنیادوں کو نہ مٹایا جن پر یہ عمارت استوار تھی تو ہمیں خطرہ ہے (اور یہ خطرہ موہوم یا مزعومہ نہیں بلکہ حتمی اور یقینی ہے) کہ ہماری نئی عمارت بھی ان ہی بنیادوں پر استوار ہو جائے گی اور پھر اس سے بھی وہی خرابیاں پیدا ہوں گی جو مرحومہ اسمبلی نے پیدا کی تھیں۔ اس لئے کہ یہ خرابیاں اس عمارت کی پیدا کردہ نہیں تھیں بلکہ ان بنیادوں کی پیدا کردہ تھیں جن پر وہ عمارت اٹھی تھی۔ لہٰذا آج جبکہ ہم پھر وہیں کھڑے ہیں جہاں اگست ۱۹۴۷ء میں کھڑے تھے (اور یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں اپنی بازآفرینی کے لئے پھر سے یہ موقعہ

عطا کر دیا ہے)، ہم اپنا فریضہ سمجھتے ہیں کہ ایک بار ان غلط بنیادوں کا پھر سے تذکرہ کر دیں جن کی وجہ سے ہماری یہ ہفت سالہ کوششیں نہ صرف رائیگاں گئیں بلکہ شاہِ ملی کا بہت سا حصہ اپنے ساتھ بہا کر لے گئیں۔ طلوع اسلام اس چھ سات سال کے عرصہ میں ان خرابیوں کو گنا تا چلا آرہا ہے۔ یہ کسی کشف یا الہام کا مدعی نہیں کہ یہ کہے کہ دیکھو ہم نے جو پیشین گوئیاں کی تھیں وہ کس طرح پوری ہو کر رہیں۔ اس نے جو کچھ کہا تھا وہ اپنی قرآنی بصیرت کے مطابق کہا تھا۔ اور قرآنی بصیرت میں یہ خصوصیت ہے کہ وہ سنکھیا کھانے والے کو بتا دیتی ہے کہ اس کا نتیجہ ہلاکت ہوگا۔

(۱) ہم ۱۹۴۸ء سے کہتے چلے آرہے ہیں کہ ملت میں مختلف پارٹیوں کا وجود اسی طرح تباہی اور ہلاکت کا موجب ہے جس طرح دین میں فرقوں کا وجود قرآن کی رو سے شرک ہے۔ حصول پاکستان کے بعد مسلم لیگ کا وجود قوم کے لئے سخت انتشار اور تشتت کا موجب اور اختلاف و افتراق کا باعث ہے۔ اب پوری کی پوری ملت خود ایک پارٹی یا جماعت ہے جس کا نصب العین یہ ہے کہ وہ اس سرزمین میں اپنے مخصوص تصوراتِ حیات کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکے۔ اس ملت کے اندر ایک پارٹی کا پیدا کر دینا اور اسے اس قسم کا تقدس عطا کر دینا کہ یہ محترم قائدِ اعظم مرحوم کی ورثہ اور تخلیقِ پاکستان کی کفیل ہے، بڑی غلط تگی ہے۔ آج ملت پاکستانیہ میں جو اختلاف اور افتراق نظر آتا ہے اس کی سب سے بڑی ذمہ دار مسلم لیگ کی الگ جماعت ہے۔ لہٰذا سب سے پہلا کرنے کا کام یہ ہے کہ ملک میں مختلف پارٹیوں کے وجود کو قانوناً ممنوع قرار دیدیا جائے اور اس کے لئے سب سے پہلے خود مسلم لیگ کو ختم کر دیا جائے۔ آنے والے الیکشن میں کوئی پارٹی لیبل نہیں ہونا چاہیئے۔

(۲) جس طرح ملت میں پارٹیوں کا وجود قوم کی تباہی کا موجب ہے اسی طرح مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی موجودہ تفریق اور مغربی پاکستان میں صوبوں کی تقسیم پورے پاکستان کی بربادی کا باعث ہے۔ یہ بات خواہ کتنی ہی ناخوشگوار کیوں نہ ہو لیکن حقیقت ہے کہ پاکستان کے مسلمان حقیقی معنوں میں ایک قوم نہیں بن سکے۔ ہم نے ہندوستان میں، تحریک پاکستان کے دعوے کی بنیاد اس اصول پر رکھی تھی کہ اسلام کی رُو سے قومیں اوطان سے نہیں بنتیں بلکہ آئیڈیالوجی کی بنا پر بنتی ہیں۔ لہٰذا ہندوستان میں بسنے والے تمام مسلمان اس آئیڈیالوجی کی بنا پر ایک الگ قوم کے افراد ہیں۔ اس دعوے کی بنیاد پر ہم نے پاکستان حاصل کیا۔ لیکن اس کے بعد ہماری حالت یہ ہے کہ ہم میں بنگالی اور غیر بنگالی دو الگ الگ قومیں ہیں۔ پھر غیر بنگالیوں میں سرحدی، پنجابی، سندھی، بلوچی، ہر ایک جداگانہ قوم کی حیثیت لئے ہوئے ہے۔ وحدتِ ملت کے اصول کے مطابق طلوع اسلام نے شروع ہی سے اس آواز کو اٹھایا تھا کہ مغربی پاکستان سے صوبوں کے وجود کو ختم کر دیا جائے اور پورے خطہ کو ایک وحدت تسلیم کیا جائے۔ ہم اس نکتہ کی اہمیت کو پھر دہراتے ہیں کہ جب تک مغربی پاکستان ایک وحدت نہیں بن جاتا ہے پاکستان میں استحکام پیدا نہیں ہو سکتا۔ ان صوبوں کو مٹایئے اور انتظامی ضرورتوں کے لئے اس قسم کے خطے بنایئے جو موجودہ صوبائی لکیروں سے ہٹے ہوئے ہوں اور جن میں مختلف صوبوں کی مشترکہ آبادیاں آجائیں۔ باقی رہا مشرقی اور مغربی پاکستان کے باہمی رابطہ کا سوال سو اگرچہ ہم نے شروع میں اس کا حل وفاقی طرزِ حکومت تجویز کیا تھا لیکن جو حالات اب پیدا ہو چکے ہیں ان کے پیشِ نظر ہم سمجھتے ہیں کہ

اس کا اطمینان بخش حل یہی ہے کہ ان دونوں خطوں میں کانفیڈریسی قائم کرکے آہستہ آہستہ کوشش کی جائے کہ ان میں آئیڈیالوجی کی بنا پر ایک قوم بننے کا جذبہ بیدار ہو جائے۔ اس کا امکان اس لئے ہے کہ اگر ان دونوں خطوں میں ایک ہی نظام یعنی قرآن کا نظام قائم ہو جائے تو اس کے بعد نسلی، لسانی، جغرافیائی امتیازات بڑی آسانی سے مٹ جاتے ہیں۔ لیکن اگر ہماری بدبختی سے یہاں قرآنی نظام نافذ نہ ہو تو پھر یہ امتیازات کبھی نہیں مٹ سکتے۔ اس صورت میں تو یہی شکل بہتر ہو سکے گی کہ یہاں الگ دو آزاد حکومتیں قائم کرکے ان میں باہمی معاہدات سے اتحاد کار البطہ پیدا کیا جائے۔ بہرحال اس ضمن میں پہلا قدم تو یہ ہے کہ مغربی پاکستان کے صوبوں کو مٹا کر ایک وحدت قائم کر دی جائے۔ اور کسی ملازمت میں خطوں کے تناسب کے اصول کو جائز قرار نہ دیا جائے۔ ملازمتوں میں صوبائی تناسب نے جس قدر باہمی نفرت اور عداوت پیدا کر دی ہے اس کے لئے موجودہ فضا خود اپنی شہادت آپ ہے۔ اور اس کی ہلاکت آفرینیوں کا اندازہ پانچ سات برس کے بعد جا کر لگے گا۔ جب یہ دیکھا جائے گا کہ ان نالائق عمال نے جو نامزدگی کے ذریعہ سے مختلف کرسیوں پر متمکن ہو گئے تھے نظم و نسق کی مشینری کو کس درجہ تباہ کر دیا ہے۔

(۳) سب سے بڑی خرابی اس وجہ سے بھی پیدا ہوئی کہ ہم نے پاکستان کا مطالبہ اس دعوے کے ساتھ کیا کہ اس میں اسلامی نظام کو رائج کیا جائے گا لیکن بدقسمتی سے ہم نے یہ طے نہ کیا کہ اسلامی نظام ہوتا کیا ہے۔ تحریک پاکستان کے دوران میں تو اس کی فرصت ہی نہ تھی۔ وہاں تو ہندو اور انگریز کی سازشیں اس تیزی سے چل رہی تھیں کہ اگر ہم ان سوالات کو لے کر بیٹھ جاتے تو پاکستان وجود ہی میں نہ آسکتا۔ پاکستان بننے کے بعد مفاد پرست لوگوں نے مذہب کا لبادہ اوڑھ کر اس دعوے کو آڑ بنا لیا اور اس کا مطالبہ شروع کر دیا کہ پاکستان میں شرعی نظام کا نفاذ ہوگا اور شرعی نظام وہ ہوگا جس کی تصویب "علمائے کرام" کریں گے۔ اس سے ملک میں عجیب قسم کا انتشار پیدا ہو گیا۔ مسلمان ہنگامہ پرست اور سطحی مذہبیت کا دلدادہ واقع ہوا ہے۔ اس وجہ سے ان لوگوں کو ملک میں ہنگامی تحریکیں پیدا کرنے اور اس راستہ میں اپنی مقبولیت حاصل کر لینے میں بڑی آسانی ہو گئی۔ اُدھر مجلس دستور ساز کے اراکین کو خود معلوم نہیں تھا کہ اسلامی نظام کسے کہتے ہیں۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ بھی اس سے متاثر ہو گئے کہ نظام شریعت فی الواقعہ "علمائے کرام" ہی بنا سکتے ہیں (یاد رکھئے کہ مُلّا اپنے گروہ کو علمائے کرام کا گروہ کہتا ہے) چنانچہ اس کے لئے علمائے کرام کا ایک بورڈ بھی بنایا گیا۔ (جسے تعلیمات اسلامی بورڈ کا نام دیا گیا) اب مصیبت یہ تھی کہ اگر آئین ان مولویوں کی منشا کے مطابق بنتا ہے تو وہ ناقابلِ عمل ہوتا ہے اور اگر کوئی قابلِ عمل آئین مرتب ہوتا ہے تو مولوی صاحبان اس کے خلاف ہنگامہ برپا کر دیتے ہیں کہ یہ شریعت کے مطابق نہیں۔ ہم سات برس تک اس مصیبت میں مبتلا رہے۔ آپ سوچئے کہ اس میں کس قدر وقت، توانائی، روپیہ اور جانیں تک ضائع ہوئیں۔ یہ ایسی بنیادی خرابی ہے کہ جب تک اس کے متعلق ذہن کو صاف نہ کر لیا جائے ہم آئین سازی کے کام میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اس میں ایک دشواری یہ بھی ہے کہ جس چیز کو آج کی اصطلاح میں کانسٹی ٹیوشن کہتے ہیں وہ مسلمانوں کی تاریخ میں کبھی مرتب ہی نہیں ہوا۔ قرنِ اوّل میں اسلامی نظام رائج تھا تو اس زمانہ میں اس قسم کے کانسٹی ٹیوشن کا سوال ہی نہیں تھا۔ اس لئے اس قسم کا کانسٹی ٹیوشن مرتب اور مدوّن شکل میں سامنے ہی

نہیں آیا۔ اس کے بعد ہمارے ہاں ملوکیت شروع ہو گئی جس میں کانسٹی ٹیوشن کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ترکوں نے ملوکیت ختم کرنے کے بعد پہلی بار یہ سوال اٹھایا کہ ہمارے ہاں کا آئین اور مختلف قوانین اسلامی ہونے چاہئیں۔ اس کے لئے انہوں نے علماء کو دعوت دی لیکن وہ آپس میں سر پھٹول کے سوا کوئی نتیجہ نہ پیدا کر سکے۔ چنانچہ ترکوں نے مجبور ہو کر یورپ کی تقلید کر لی۔ یعنی مذہب کو ایک نجی چیز قرار دیدیا۔ اور امور سلطنت کو دنیاوی طریق سے سرانجام دینے لگے۔ اس کے بعد یہ دوسری کوشش پاکستان میں ہو رہی ہے۔ اس میں بھی ان علماء نے جس قدر فتور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کانسٹی ٹیوشن کا بنانا تو ایک طرف اس کا سمجھنا بھی ان لوگوں کے بس کی بات نہیں۔ باقی رہے ان کے مقاصد سو اس کے متعلق اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ حضرات کل تک اس آئین کو غیر اسلامی قرار دے رہے تھے۔ جو مجلس آئین ساز تیار کر رہی تھی۔ لیکن جب پچھلے دنوں یہ سوال اٹھا کہ مجلس دستور ساز کو توڑ دیا جائے تو ان میں سے ہر ایک پکار اٹھا کہ جس مجلس نے اس قسم کا "اسلامی آئین" بنا کر دیا ہے اسے توڑ دینا بہت بڑا جرم ہے۔ دنیا حیران تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ لیکن انہیں معلوم نہیں کہ اس آئین میں یہ شق رکھ دی گئی تھی کہ حکومت پاکستان "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کا ایک ادارہ قائم کرے گی۔ یہ علمائے کرام اور ان کی جماعتیں اس ادارہ کی تاک لگائے بیٹھی تھیں اور دن گن رہی تھیں کہ کب یہ کانسٹی ٹیوشن پاس ہو اور یہ ان سرکاری گدیوں پر براجمان ہو جائیں۔ مجلس آئین ساز کے ٹوٹنے سے ان کا یہ حسین خواب پریشان ہو رہا تھا یہ وجہ تھی کہ اس اسمبلی کے توڑنے کے خلاف اس قدر شور مچایا جا رہا تھا اور اس کے پیش نظر آئین کو اسلامی قرار دیا جا رہا تھا۔ یاد رکھئے، ان حضرات کے نقطۂ نظر سے ہر وہ آئین جس میں ان کی معاش اور اقتدار کی گنجائش ہو گی اسلامی ہو گا۔ (خواہ اس میں یہ بھی بصراحت کیوں نہ لکھ دیا گیا ہو کہ مملکت کے مالیات کم از کم پچیس سال تک خدا اور اس کے رسول کے احکام سے بالاتر ہوں گے) اور جس آئین میں ان چیزوں کی رعایت نہیں رکھی جائے گی وہ غیر اسلامی قرار پائے گا۔

جیسا کہ طلوع اسلام برابر لکھتا چلا آ رہا ہے اسلامی نظام کو ان مولوی صاحبان نے خواہ مخواہ ہوّا بنا رکھا ہے۔ اسلامی نظام کی بنیاد یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے قرآن میں وہ غیر متبدل اصول (مستقل اقدار) متعین کر کے دیدیئے ہیں جن کے مطابق انسانوں کو اپنے معاشرہ کو متشکل کرنا ہو گا۔ ہر زمانہ کے انسانوں کو اس کا پورا اختیار ہے کہ وہ ان حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے ایسا آئین مرتب کر لیں جو ان کی ضروریات کو پورا کر سکے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس کے لئے دو ہی باتوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے ایک تو قرآن کے غیر متبدل اصول اور دوسرے اپنے زمانہ کے تقاضے۔ جہاں تک قرآنی رہنمائی کا تعلق ہے اس کا دعویٰ ہے کہ ایک آسان کتاب ہے۔ لہٰذا یہ باتیں تھوڑی سی محنت سے سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ باقی چیز ہے اپنے زمانہ کے تقاضے۔ سو اس کے لئے مغربی تعلیم نہایت ضروری ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر نئے انتخابات میں مجلس آئین ساز کی رکنیت کے لئے یہ شرط عائد کر دی جائے کہ اس کے لئے کم از کم گریجویٹ ہونا ضروری ہے اور اتنی استعداد بھی ضروری ہے کہ وہ بتا سکے کہ قرآن میں فلاں اصولی بات کے متعلق کہاں ذکر آیا ہے۔ اور وہ مجلس کی بحث کے دوران میں ان مقامات کو پیش کر سکے تو بظاہر یہ بات چھوٹی سی

نظر آئے گی۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ اس کے نتائج بڑے امید افزا اور خوشگوار ہوں گے۔ ہمارے نزدیک دو ٹرکوں کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ کم از کم ٹیرک ہوں۔

(۴) یہیں سے آپ نے یہ بھی دیکھ لیا ہوگا کہ ایک اسلامی مملکت کی آئین سازی کے کام میں کوئی غیر مسلم شریک نہیں ہو سکتا۔ یہ آئین اسلامک آئیڈیالوجی پر مبنی ہوتا ہے اور جو شخص اس آئیڈیالوجی ہی کو صحیح نہیں مانتا اور قرآن کی حدود کو تسلیم نہیں کرتا وہ اس کے مطابق آئین کیا بنائے گا اور مشورہ کیا دے گا؟ لہٰذا غیر مسلم حضرات ہماری آئین سازی کے کام میں شریک نہیں ہو سکتے۔ ان کا کام صرف یہ ہے کہ وہ بتا دیں کہ ان کا پرسنل لاء کیا ہوگا اور وہ پاکستان میں کس قسم کے تحفظات چاہتے ہیں۔ وہ اپنے مابین ان چیزوں کو متعین کر کے ہمیں دیدیں، ہم ان چیزوں کو اپنے آئین میں شامل کر لیں گے۔ یہ وہ پوزیشن ہے جسے غیر مسلم حضرات پر صاف طور پر واضح کر دینا چاہیئے۔ ٹوٹنے والی اسمبلی میں ان کی شرکت نے جو خرابیاں پیدا کیں ان کا تلخ تجربہ اس حقیقت کی بیّن دلیل ہے کہ قرآن نے کیوں کہا تھا کہ تمہاری حکومت کے معاملات تمہارے اپنے مشورہ سے طے پانے چاہئیں اور کوئی غیر مسلم تمہارے اس اندرونی سرکل میں شریک نہیں ہونا چاہیئے؟

(۵) سب سے اہم سوال یہ ہے کہ جہاں تک افراد کا تعلق ہے ایک اسلامی مملکت کا فریضہ کیا ہے۔ قرآن کے واضح الفاظ میں اس کا فریضہ ہے کہ کوئی فرد معاشرہ اپنی بنیادی ضروریات زندگی سے محروم نہ رہے۔ جس مملکت میں کوئی ایک فرد بھی بھوکا سو جائے، بیمار جائے یا اس کی پناہ کے لئے مکان نہ ہو، یا بیماری میں علاج اور بچوں کے لئے تعلیم کا انتظام نہ ہو وہ مملکت کبھی اسلامی نہیں کہلا سکتی۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ کوئی مملکت ان فرائض سے عہدہ برا نہیں ہو سکتی جب تک پیداوار کے قدرتی اور مصنوعی وسائل و ذرائع افراد کی ملکیت کے بجائے اس کی تحویل میں نہ ہوں۔ لہٰذا ایک اسلامی مملکت کے آئین کی بنیاد ہی اس پر ہوگی کہ اس میں پیداوار کے وسائل و ذرائع ملت کی تحویل میں رہیں گے۔ تاکہ وہ انہیں قوانین خداوندی کے مطابق صرف کرے اور ہر فرد معاشرہ کی ضروریات زندگی پوری ہوتی رہیں اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی چلی جائے۔

(۶) قوم کی وحدت کے لئے زبان کی وحدت بنیادی شے ہے۔ یعنی اس زبان کی وحدت جو مملکت اختیار کرے اور جس کے ذریعہ اس قوم کی معاشرتی روایات کا تحفظ ہو اور اس کی ثقافت پروان چڑھے۔ جو اس کے علوم و فنون کی زبان اور اس کے معاملات کی ترجمان ہو۔ اگر حکومت خلوص اور تندہی سے کام کرے تو یہ کچھ بھی مشکل نہ ہوگا کہ مشرقی بنگال کے بالغ افراد کو دو تین برس میں اتنی اردو سکھا دی جائے کہ وہ اس میں آسانی سے لکھ پڑھ سکیں۔ اگر بنگال کی مسلم لیگی حکومت حماقت نہ کرتی تو یہ کام اب سے بہت پہلے کا ہو چکا ہوتا۔

(۷) بہرحال یہ ہیں وہ بنیادی خط و خال جن کو سامنے رکھ کر آنے والی نئی مجلس دستور ساز کی ترتیب و تشکیل کیلئے

کوئی قدم اٹھانا چاہیئے۔ اگر اس میں ایسے ارکان آگئے جو ان تصورات پر یقین رکھتے ہوں تو وہ چھ مہینے کے اندر اندر ایسا آئین بنا سکتے ہیں جسے صحیح معنوں میں اسلامی آئین کہا جا سکے اور وہ پاکستان کو اس قابل بنا دے کہ وہ اقوام عالم میں باعزت مقام حاصل کرلے اگر خدانخواستہ ایسا نہ ہوا اور نئی مجلس بھی انہی جیسے افراد پر مشتمل ہوگئی جن سے خدا خدا کر کے پیچھا چھوٹا ہے تو اس کے بعد ہمارے زندہ رہنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہے گی اس لئے کہ زمانہ کسی کو بار بار مہلت نہیں دیا کرتا کہ وہ اپنی حماقتوں کی تلافی کر سکے۔ یہ مہلت جو ہمیں اس وقت ملی ہے ہم تو اپنے آپ کو اس کا بھی اہل نہیں سمجھتے تھے۔ شاید یہ اس لئے ہے کہ اس سرزمین سے تیرہ سو سال کے بعد پہلی بار قرآن کی آواز اٹھی ہے اور قدرت کو یہ منظور ہے کہ تیرہ سو سال کے بعد ایک بار پھر قرآنی نظام اپنی عملی شکل میں سامنے آجائے اور دنیا دیکھ لے کہ قرآن کا یہ وعدہ کس قدر سچا ہے کہ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا۔ زمین اپنے پروردش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔

اب ہمارا روئے سخن قارئین طلوع اسلام کی طرف ہے۔ آپ مسلسل چھ سات برس سے دیکھ رہے ہیں کہ طلوع اسلام کانسٹی ٹیوشن کے سلسلہ میں کیا کچھ کہتا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی آپ یہ بھی دیکھتے رہے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو کس قدر بے بس محسوس کرتا تھا جب وہ یہ دیکھتا تھا کہ جو لوگ ہماری شومئی قسمت سے آئین سازی کے کام کو لے کر بیٹھے تھے وہ اس سے کچھ اثر نہیں لیتے تھے جو کچھ ان سے کہا جاتا تھا یا تو ان میں اس کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں تھی اور اگر سمجھنے کی صلاحیت تھی تو وہ اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے تھے کہ انہیں کوئی صحیح اسلامی آئین مرتب کرنا چاہیئے۔ طلوع اسلام کی امیدیں اب اس خیال سے وابستہ تھیں کہ جب اس کانسٹی ٹیوشن کے بعد نئی اسمبلی بننے کا وقت آئے گا تو اس وقت ایسی کوشش کی جائے کہ اس میں ایسے لوگ آجائیں جو قرآنی تصور زندگی کو سمجھنے کی صلاحیت رکھیں اور انہیں عملاً نافذ کرنے کی تڑپ ان کے دل میں موجود ہو۔ لیکن یہ قدرت کا کرشمہ ہے کہ اس نے اس سارے غلط آئین کو جو انہوں نے بنایا تھا یوں کالعدم کر دیا اور اس کا موقعہ ہم پہنچا دیا کہ قوم کے نئے نمائندے از سر نو آئین مرتب کریں۔ لہٰذا ہمارے پاس آج سے الیکشن ہونے تک کا وقت ہے۔ اگر ہم نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھا لیا تو اس کا امکان ہے کہ اس مملکت میں قرآن کا نظام نافذ ہو سکے۔ لیکن اس کے لئے بڑا کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں پہلی ضرورت یہ ہے کہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کی مشینری کو تیز تر کر دیا جائے۔ طلوع اسلام نے اس سے پہلے ایک اسکیم پیش کی تھی کہ طلوع اسلام کو روزانہ نہیں تو کم از کم ہفتہ وار کر دیا جائے اور اس کا انگریزی کا ایڈیشن بھی شائع کیا جائے لیکن سرمایہ اکٹھا نہ ہونے کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اب وہ وقت نہیں رہا کہ اس میں مزید تاخیر کی جائے۔ طلوع اسلام نے آج تک کسی سے عطیے قبول نہیں کئے۔ لیکن وہ سمجھتا ہے کہ اگر اس نے اب کوتاہی کی تو وہ قرآن کی بارگاہ میں بہت بڑا مجرم سمجھا جائے گا۔ لہٰذا وہ اس عظیم مقصد کے لئے اپنے سابقہ اصول کو توڑ کر عطیوں کیلئے

جھولی پھیلانے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ اس کے لئے چھوٹی اور بڑی رقم کی بھی کوئی تخصیص نہیں۔ جتنا کچھ کوئی دے سکتا ہو دیدے لیکن بغیر کسی شرط عائد کرنے کے۔ ہم اسے قرآنی نظام اور اس کے تصور کو عام کرنے میں صرف کریں گے۔ اور اس معاملہ میں ہمارے اور ان کے درمیان خدا شاہد رہے گا۔ آپ ہر دست روپیہ نہ بھیجئے۔ ہمیں فوراً اطلاع دیجئے کہ آپ اس مقصد کے لئے کیا دے سکتے ہیں۔ اس میں تاخیر نہ کیجئے تاکہ ہم آئندہ اشاعت تک بتا سکیں کہ اس میں کتنی کامیابی ہوئی ہے اور اس کے بعد آپ کو کیا کرنا ہے آج ہی سے اپنے خدا سے عہد کر لیجئے کہ آپ نے قرآنی تصور کی نشر و اشاعت کے لئے اپنی زندگی کا ایک ایک فالتو لمحہ صرف کر دینا ہے۔

ہم یہ لکھ رہے ہیں اور ہمارے سامنے وہ استفسارات آ رہے ہیں جو ہمیں قارئین کی طرف سے موصول ہوں گے۔ یعنی یہ استفسار کہ "ہم کیا کریں؟" جیسا کہ ہم اس سے پیشتر کئی بار لکھ چکے ہیں، ہمیں ہنگامی تحریکوں کا اس قدر خوگر بنا دیا گیا ہے کہ ہمارے نزدیک کوئی فکری تحریک، تحریک۔ اور کوئی ذہنی انقلاب، انقلاب ہی قرار نہیں پاتا۔ ہم بار بار کہہ چکے ہیں کہ ہماری جذبات پرست قوم کو ان ہنگامی تحریکوں نے جس قدر تباہ کن نقصان پہنچایا ہے اس کا اندازہ آنے والا مورخ ہی لگا سکے گا۔ دنیا میں شاید ہی کوئی اور قوم ایسی ہو جس نے اتنے لمبے عرصہ تک مسلسل اس قدر مالی اور جانی قربانیاں دی ہوں اور وہ سب کی سب نہ صرف رائگاں گئی ہوں بلکہ انفرادی نقصان اور اجتماعی خسران کا موجب بنی ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری مذہبیت تو سطحی تھی ہی، ہماری سیاست بھی سطحی (بلکہ بازاری) بن کر رہ گئی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم نے اس تمام عرصہ میں قوم میں فکری تبدیلی کی کوئی کوشش نہیں کی۔ یاد رکھئے۔ کسی قوم میں صحیح انقلاب نہیں آ سکتا جب تک اس کے قلب و نگاہ میں صحیح انقلاب نہ پیدا ہو۔ طلوع اسلام کو اس انقلاب کی صحیح صحیح قیمت اور اہمیت کا اچھی طرح احساس ہے اور اسی لئے وہ بار بار اور پیہم اسی پر زور دیتا چلا آ رہا ہے۔ ہم سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ اس فکری دعوت کا سلسلہ بالآخر کب تک جاری رہے گا؟ ہم اس کے جواب میں پوچھنا چاہتے ہیں کہ آپ اس فکری انقلاب کو کس حد تک پیدا کر چکے ہیں؟ پاکستان کی کروڑوں کی آبادی میں کتنے لوگ ایسے ہیں جن میں صحیح قرآنی فکر پیدا ہو چکا ہے؟ یہ تو خیر بہت بھی دور کی بات ہے۔ کتنے لوگ ایسے ہیں جن تک اس قرآنی انقلاب کی آواز ہی پہنچ سکی ہے؟ دوسروں کو چھوڑیئے۔ آپ پہلے اپنا جائزہ لیجئے اور سوچئے کہ کیا آپ کے اپنے اندر ایسی تبدیلی پیدا ہو چکی ہے کہ آپ کے سامنے جو سوال بھی آئے آپ اس کا حل قرآن کی روشنی میں سوچ سکیں۔ یا کم از کم اتنا ہی سوچئے کہ آپ نے قرآن کی اس آواز کو کتنے لوگوں تک پہنچایا ہے اور کتنے سوچنے والوں کو اپنا ہم نوا بنایا ہے؟ آپ کو ان سوالات کا جو جواب اپنے دل سے ملے آپ اس سے اندازہ لگا لیجئے کہ پاکستان میں یہ قرآنی فکر کس حد تک پھیل چکا اور جائے گیر ہو چکا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ ہم سے متفق ہوں گے کہ اس باب میں جو کچھ ہونا چاہیئے اس کا ہزارواں حصہ بھی ابھی تک نہیں ہو سکا۔ سو جب صورت یہ ہو تو پھر یہ کہنا کہ اس فکری دعوت کا سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ حقیقت کا سامنا کرنے سے جی چرانا اور ہنگامہ پرستی کے اس جذبہ کی تسکین کا سامان فراہم کرنا ہے جو آپ کے تحت الشعور میں کروٹیں

لے رہا ہے اور جس میں عجلت پسند انسانوں کو بڑی لذت ملتی ہے۔

اندریں حالات ہم آپ سے ایک بار پھر عرض کریں گے کہ یہ کہہ کر اپنے آپ کو دھوکے میں نہ رکھئے کہ فکری انقلاب کے لئے بہت کچھ ہو چکا ہے۔ اب کچھ ہنگامہ خیزی بھی ہونی چاہیئے۔ کم از کم طلوع اسلام اپنے آپ کو اس دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ فکری انقلاب کس حد تک پیدا ہو چکا ہے اور ابھی کس قدر کرنے کا کام باقی ہے۔ باقی رہا یہ کہ وقت بہت کم ہے۔ سو وقت کی کمی کو کام کی رفتار کی تیزی سے پورا کیا جا سکتا ہے۔ اگر طلوع اسلام کے پاس آج دو چار اردو کے اور ایک دو انگریزی کے روزنامے ہوں۔ اگر اس کے ادارے میں پانچ دس صاحب فکر ریسرچ میں مصروف ہوں۔ اگر اس کے ہم نواؤں میں دو چار ہزار افراد ایسے ہوں جو قرآن کی آواز کو گھر گھر تک پہنچا دیں۔ تو آپ دیکھیں گے کہ چھ ماہ کے اندر اندر ملک میں کیسا انقلاب برپا ہو جاتا ہے؛ لیکن جہاں حالت یہ ہو کہ لے دے کے ایک ماہوار پرچہ ہو اور اس کی بھی یہ کیفیت کہ

رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہن مے

اس سے یہ سمجھ لینا کہ اب ملک میں پورے طور پر ذہنی انقلاب پیدا ہو چکا ہے، خود فریبی کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ تو یوں سمجھئے کہ قرآن کی آواز میں خود اتنی قوت ہے کہ وہ اتنے سے کم اسباب و ذرائع کے باوجود اتنا نمایاں نتیجہ پیدا کر رہی ہے کہ اس ایک پرچہ اور اس کی طرف سے شائع شدہ لٹریچر نے ملک میں قرآنی فضا پیدا کر دی ہے، ورنہ اس نقارخانہ میں طوطی کی آواز سے بنتا کیا ہے؛ پھر اتنا ہی نہیں کہ طلوع اسلام کے پاس ساز و یراق کی اس قدر کمی ہے۔ اس کی مخالفت کا یہ عالم ہے کہ مفاد پرستی کے لشکر شاید ہی اس سے پہلے کبھی اس طرح متحد ہو کر کسی کام کے لئے اکٹھے ہوں۔ اس لئے کہ اس سے پہلے شاید ہی کبھی خالص قرآن کی آواز اس طرح بلند ہوئی ہو۔ لیکن اس کے باوجود آپ دیکھیں گے کہ یہ شور و شغب سب ختم ہو جائے گا۔ اور قرآن کی آواز عالمگیر ہوتی چلی جائے گی۔ ان حالات میں آپ سوچئے کہ آپ کا فریضہ کیا ہے؟ ہم جیسا کہ پہلے بھی لکھ چکے ہیں، ہمارا دور آئینی دور ہے لہذا اس میں انقلاب آئین ہی کے ذریعے آئے گا۔ خدا کا احسان ہے کہ ہمیں اتنا موقع اور مل گیا ہے کہ ہم اس آئینی انقلاب کے لئے زمین کو ہموار اور فضا کو سازگار کر سکیں۔ مسلمانوں کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ ہمیں اس کا موقعہ دیا گیا ہے کہ ہم چاہیں تو یہاں قرآنی نظام قائم کر لیں۔ اگر ہم نے اس موقع کو ضائع کر دیا تو نہ صرف یہ کہ ہم خود ہی تباہ و برباد ہو جائیں گے بلکہ پوری نوع انسانی کی ہلاکتوں اور بربادیوں کی ذمہ داری بھی ہماری گردن پر ہوگی۔ یہ ہے وہ احساس جس کے ماتحت ہم نے، اپنے پرانے اصول کو تیاگتے ہوئے، آپ سے امداد کی اپیل کی ہے۔ ہم اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتے ورنہ جی چاہتا تھا کہ اپنا دل آپ کے سینے میں رکھ دیتے۔ اس کے بعد ہمیں آپ سے کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہ رہتی۔

دوستو! آؤ۔ ایک دفعہ کوشش کر کے دیکھ لیں۔ شاید اس دنیا میں قرآنی نظام کے قیام کی سعادت آپ ہی کے حصے میں آ جائے۔ کتنا بڑا خوش بخت ہے وہ جس کے نصیب میں یہ سعادت آ جائے اور وہ یہ کہتا ہوا جائے کہ

ابدی بادہ بہار تو کہ در انجمنت　　　کف خاک آدمم و جوش بہاران زدہ‌ام

سلیم کے نام

خطوط کا مجموعہ

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا تھا۔ دوسرا ایڈیشن پریس میں ہے۔ جن حضرات کی فرمائشیں موصول ہو چکی ہیں انہیں تھوڑے دنوں تک اور انتظار کرنا ہوگا۔
کتاب جلد تیار ہو جائے گی۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳۔ کراچی

نوادرات

مجموعہ مضامین علامہ اسلم جیراجپوری مد ظلہٗ

بڑا سائز۔ ضخامت چار سو صفحات۔ قیمت چار روپے

ناظم ادارہ طلوع اسلام کراچی

ضرورت ہے

اردو مختصر نویس کی جس کی اردو قابلیت اتنی زیادہ ہو کہ عربی اور فارسی کے الفاظ بھی صحت کے ساتھ لکھ سکے۔

تنخواہ معقول۔ لیکن وہی حضرات آپ کا خیال کریں جو فرقہ دارانہ و صوبجاتی تعصب سے بلند ہوں۔ درخواست جلد بھیجیں۔

پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳۔ کراچی

کراچی میں بہت بڑا بنگلہ

جو دو منزلہ ہے اور ابھی ابھی بن کر تیار ہوا ہے۔
کرایہ یا فروخت کے لئے موجود ہے۔
رہائش، آسائش اور آرائش ہر لحاظ سے قابل ستائش۔ فراخ۔ ہوادار۔ پختہ۔ بجلی پانی موجود اعلیٰ ڈیزائن۔

خط و کتابت کا پتہ

پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳۔ کراچی

سردار عبدالرب نشتر کا جواب

طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت میں ہم نے مجلس آئین ساز کی روئیداد پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا کہ مسٹر چٹو پادھیا نے ہمارے نام نہاد اسلامک کانسٹی ٹیوشن پر کیا کیا اعتراض کئے اور محترم سردار عبدالرب نشتر صاحب نے ان کے کیا کیا جواب دیئے۔ اسی ضمن میں ہم نے ایک جواب کے سلسلہ میں لکھا تھا کہ اگر محترم نشتر صاحب اس کی وضاحت فرمانا چاہیں تو طلوع اسلام اسے بمسرت شائع کرے گا۔ چنانچہ اس پرچہ کی ایک کاپی، ایک خط کے ساتھ محترم نشتر صاحب کی خدمت میں بھیجی گئی۔ انھوں نے ازرہ کرم اس خط کا جواب بھیجا ہے۔ چونکہ یہ معاملہ نجی نہیں بلکہ اس کا تعلق ملک کے آئین سے ہے اسلئے ہم ان کا خط اور اپنا مختصر سا تبصرہ طلوع اسلام میں شائع کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کا جواب یہ ہے:۔

کراچی ۲۰-۹-۵۴ مکرمی السلام علیکم۔ گرامی نامہ مورخہ ۵-۹-۵۴ ملا۔ شکریہ۔ بوجہ مصروفیت افسوس ہے کہ جواب دینے میں دیر ہوگئی۔ آپ کا فرستادہ رسالہ مجھے پہنچ گیا تھا۔ کاش تنقید کرنے والے صاحب میری تقریر تفصیلاً پڑھ کر قلم اٹھاتے تاکہ ان کی بعض غلط فہمیاں تو دور ہو جاتیں۔ لیکن کسی مدیر کا محض اخباری خلاصوں کی بنا پر خیال آرائی کرنا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ باقی رہی یہ سنت کی بحث تو مجھ سے بہتر اور عالم لوگ طلوع اسلام والوں کے اعتراضات اور نظریات کے جوابات دیتے رہتے ہیں میں ان الجھنوں میں نہ الجھنا چاہتا ہوں اور نہ الجھنا مناسب سمجھتا ہوں۔ اپنا تو یہ عقیدہ ہے کہ

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست　　اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

خدا کرے اس عقیدہ کے مطابق عمل بھی کرسکوں وبیدہ التوفیق۔ والسلام　　احقر الانام　　نشتر

ہمارے ہاں عام طور پر یہ رواج ہوگیا ہے کہ لیڈر حضرات تقریریں کرتے ہیں، بیانات دیتے ہیں، اخباری نمائندوں کو انٹرویو دیتے ہیں۔ یہ سب کچھ اخبارات میں چھپتا ہے اور وہ اسے نہایت سکون اور خوشی سے پڑھ لیتے ہیں۔ پھر اگر ایسا ہو کہ ان کی کسی تقریر، یا بیان وغیرہ پر کوئی اعتراض کیا جائے تو ان کا پہلا جواب یہ ہوتا ہے کہ معترض نے یونہی جستہ جستہ اقتباس دیکھے ہیں، میرا سارا بیان پڑھا نہیں۔ اور اگر یہ کہدیا جائے کہ آپ کا سارا بیان پڑھ لیا گیا تھا تو وہ نہایت بے اعتنائی سے فرما دیتے ہیں کہ وہ اخبارات میں صحیح طور پر شائع نہیں ہوا تھا۔ اب ان سے کون کہے کہ اگر وہ صحیح شائع نہیں ہوا تھا تو کیا آپ کا فریضہ نہیں تھا کہ اخبار میں اس کی تصحیح شائع کراتے؟ عوام تک آپ کی باتیں اخبارات ہی کے ذریعہ پہنچتی ہیں۔ اگر اخبارات میں کوئی غلط بات آپ کی طرف منسوب کی جاتی ہے اور آپ اس کی تردید نہیں کرتے یا تصحیح نہیں فرماتے تو اس کی ذمہ داری آپ ہی پر ہے نہ کہ دوسروں پر۔

ہم محترم سردار صاحب کی خدمت میں عرض کریں گے کہ طلوع اسلام نے محض اخباری "خلاصوں" کی بنا پر ہی خیال آرائی نہیں شروع کر دی تھی۔ بایں ہمہ اگر محترم نشتر صاحب نے اس باب میں کوئی غلط فہمی محسوس کی تھی تو وہ ہمیں بتا دیتے۔ اس کے بعد ہم عرض کرتے کہ وہ چیز ان کی اصل تقریر پر مبنی ہے یا اس کے مبہم خلاصے پر۔

(۲) محترم نشتر صاحب اپنے جواب میں فرماتے ہیں "باقی رہی سنت کی بحث تو مجھ سے بہتر اور عالم لوگ طلوع اسلام والوں کے اعتراضات اور نظریات کے جوابات دیتے رہتے ہیں۔ میں ان بحثوں میں نہ الجھنا چاہتا ہوں اور نہ الجھنا مناسب سمجھتا ہوں"۔ کیا ہم محترم نشتر صاحب سے پوچھ سکتے ہیں کہ طلوع اسلام نے کس جگہ سنت کی بحث چھیڑی تھی جس میں نہ آپ الجھنا چاہتے ہیں اور نہ الجھنا مناسب سمجھتے ہیں؟ بات اتنی سی تھی کہ مسٹر چٹو پادھیا نے یہ اعتراض کیا کہ جب اسلامی شریعت نے تمام امور کے فیصلے پہلے ہی سے کر رکھے ہیں (اور اس کی سند علمائے کرام کے وہ بیانات ہیں جو انھوں نے منیر کمیٹی کے سامنے دیئے تھے) تو پھر ایک اسلامی مملکت میں قانون سازی کی گنجائش کہاں ہے۔ اس کے جواب میں محترم نشتر صاحب نے فرمایا کہ "مسٹر چٹو پادھیا غلط سمجھے ہیں۔ اصلی بات یہ ہے کہ زندگی کے وہ معاملات جنھیں قرآن نے انسانی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے ——— اور یہ قریباً پچانوے فیصدی امور پر مشتمل ہیں ——— ان میں ہمیں اختیار دیا گیا ہے کہ ہم خود قانون بنالیں۔ اس لئے اسلامی مملکت میں انسانوں کے قانون سازی کے اختیار پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ان امور میں ہم جو قوانین بنائیں گے وہ نافذ العمل ہوں گے۔ غیر قانونی فیصلے صرف وہ ہوں گے جو قرآن کے خلاف جائیں گے۔

اس پر ہم نے یہ لکھا تھا کہ

ہم اتنا باادب پوچھنا چاہتے ہیں کہ آپ کی پاس کردہ قرارداد مقاصد میں (جسے آپ کی بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے آئین کا جزو لاینفک قرار دیا ہے) قرآن کے ساتھ سنت کا لفظ بھی موجود ہے اور (جیسا کہ منیر رپورٹ میں درج ہے) علمائے اہل سنت کے نزدیک زندگی کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس کے متعلق سنت رسول اللہ (یعنی احادیث) میں پہلے سے فیصلہ موجود نہ ہو۔ یعنی قرآن نے جن پچانوے فیصدی امور کو غیر متعین چھوڑا تھا ان کا تعین پہلے ہی سے احادیث میں ہو چکا ہے۔

اب یہ فرمایئے کہ

(۱) کیا آپ کے نزدیک یہ پوزیشن صحیح ہے یا نہیں؟

(۲) اگر یہ صحیح ہے تو پھر آپ نے یہ کس طرح کہہ دیا کہ ہمیں پچانوے فی صدی امور میں قانون سازی کا حق حاصل ہے۔ اور

(۳) اگر یہ صحیح نہیں تو قرارداد مقاصد میں قرآن کے ساتھ سنت کے لفظ کے کیا معنی ہیں اور وہاں صرف قرآن کے بجائے قرآن اور سنت کیوں رکھا گیا ہے؟

یہ تھی وہ بات جو ہم نے دریافت کی تھی اور وہ ہے اس کا جواب جو نشتر صاحب نے عنایت فرمایا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ یہ کتنا اہم اور بنیادی سوال تھا جسے مسٹر چٹوپادھیا نے اٹھایا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ جب آپ کے ہاں تمام امور کے فیصلے پہلے سے ہو چکے ہوئے ہیں تو پھر مجلس قانون ساز کیا کرے گی۔ اس کے جواب میں محترم نشتر صاحب یہ فرماتے ہیں کہ نہیں قرآن کی رو سے ہم پچانوے فی صدی امور میں خود قانون بنا سکتے ہیں۔ حالانکہ سوال یہ نہیں تھا کہ قرآن کی رو سے پوزیشن کیا ہے۔ سوال یہ تھا کہ قرآن اور سنت کی رو سے پوزیشن کیا ہے۔ چونکہ سنت کو ساتھ لانے میں مسٹر چٹوپادھیا کے اعتراض کا کوئی جواب نہیں بن پڑتا تھا اس لئے وہاں تو نشتر صاحب نے اپنے وکیلانہ حربہ سے کام لیا اور صرف قرآن کہہ کر (بزعم خویش) مقدمہ جیت لیا لیکن اس کے بعد جب یہ اعتراض ہوا کہ آپ کے کانسٹی ٹیوشن میں قرآن کے ساتھ سنت بھی تو موجود ہے۔ آپ نے تنہا قرآن کیوں کہا؟ تو فرمادیا کہ نہیں ہمارا تو یہ عقیدہ ہے کہ "بمصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست"

یہ ہے نمونہ ان حضرات کے قلب و دماغ کا جنھیں ایک اسلامی مملکت کی آئین سازی کا کام سونپ دیا گیا تھا۔ یہ تو غنیمت ہوا کہ محترم گورنر جنرل نے اس اسمبلی ہی کو برخاست کر دیا ورنہ اگر یہی آئین ملت کے سر پر تھوپ دیا جاتا تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس کی کیا حالت ہوتی۔

ضمناً اتنا اور عرض کر دیا جائے کہ اقبالؒ نے جو کہا تھا کہ "بمصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست" تو یہ حسین احمد صاحب مدنی کے اس غلط نظریہ کی تردید میں کہا تھا کہ "ملتیں اوطان سے بنتی ہیں" چنانچہ اس سے پہلا شعر یہ ہے۔

سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است چہ بے خبر ز مقام محمدؐ عربی است

یعنی مقام محمد عربی تو یہ ہے کہ ملت ایمان سے بنتی ہے اور مدنی صاحب یہ فرما رہے ہیں کہ ملت وطن سے بنتی ہے!

باقی رہا دین کا معاملہ سو اس کے متعلق عرض ہے کہ دین خدا کی طرف سے ملتا ہے اور رسول اس دین کا لانے والا ہوتا ہے۔ جیسا کہ خود قرآن میں ہے: هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ یعنی خدا اپنے رسول کو دین دے کر بھیجتا ہے۔ واضح رہے کہ دین اور آئین کی بنیاد حقائق پر ہوتی ہے لطائف پر نہیں۔ خدا کرے کہ ہماری نئی مجلس آئین ساز کے اراکین اس حقیقت کو سمجھ لیں۔

٭

ایک موقعہ پھر مل گیا

محترم گورنر جنرل نے فیصلہ کر دیا کہ موجودہ آئین ساز اسمبلی توڑ دی گئی ہے۔ اب نئے الیکشن ہونگے اور نئی اسمبلی از سر نو آئین سازی کا کام شروع کرے گی۔

ان لوگوں کے لئے جو اپنے دل میں یہ تڑپ رکھتے تھے کہ پاکستان میں کسی نہ کسی طرح قرآنی نظام نافذ ہو جائے قدرت نے ایک نادر موقعہ بہم پہنچا دیا۔

قرآنی نظام اپنے اندر اتنی قوت رکھتا ہے کہ جو شخص اسے ایک دفعہ سمجھ لے وہ اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ لیکن اس نظام کا دوسروں تک پہنچانا تو ہمارا فرض ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر ہم نے اس مہلت کے وقفہ میں قرآنی نظام کے پھیلانے کیلئے پوری پوری کوشش کر لی تو ہم ضرور کامیاب ہو جائیں گے کہ نئی اسمبلی میں جو لوگ آئیں ان کے سامنے یہ نقشہ واضح طور پر موجود ہو۔

اس کے لئے پہلا قدم یہ ہے کہ طلوع اسلام کو ہفتہ وار کر دیا جائے اور اس کا انگریزی ایڈیشن بھی شائع کیا جائے۔ اس کے لئے روپیہ درکار ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے۔

اس مقصد کے لئے ہم آپ سے مدد مانگتے ہیں۔ آپ اپنے دل کی مرضی سے بغیر کسی شرط کے جو کچھ دے سکتے ہوں اس کا اپنے دل میں فیصلہ کیجئے اور ہمیں اطلاع دیجئے۔ لفافہ کے باہر "ہفتہ وار اسکیم" لکھئے۔ یہ اطلاع ہم تک جلد از جلد پہنچ جانی چاہئے تاکہ ہم آئندہ اشاعت تک بتا سکیں کہ اب کیا کیا جائے گا۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام

پوسٹ بکس ۷۳۱۳۔ کراچی ۳

شرعی قوانین کی تجدید

[۱۹۵۳ء کے موسم گرما میں حسنِ اتفاق سے مختلف ممالک اسلامیہ کے اربابِ علم و فضل اور کئی ایک مستشرقین ممالک متحدہ امریکہ میں اکٹھے ہو گئے۔ اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر پرنسٹن یونیورسٹی اور امریکن کانگریس لائبریری کے منتظمین نے ثقافت اسلامیہ کی ایک غیر رسمی کانفرنس منعقد کر لی جس میں مختلف موضوعات پر مقالے پڑھے گئے اور مذاکرات ہوئے۔ کانفرنس کو جو مذاکرہ ہوا، اس کا موضوع یہ تھا کہ مختلف اسلامی ممالک میں شرعی قوانین کو زمانہ حاضرہ کے تقاضوں کے ساتھ کس طرح تطبیق دی جائے۔ منتظمین کی طرف سے اس کانفرنس کی روئیداد شائع ہوئی ہے جس کا عنوان ہے "مُؤْتَمَرُ الثَّقَافَةِ الْإِسْلَامِيَّةِ وَعِلَاقَتُهَا بِالْعَالَمِ الْمُعَاصِرِ"۔ ہمارے محترم اے ایم انصاری صاحب ریٹائرڈ رجسٹرار عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد (دکن) نے اس روئیداد میں سے ۱۴ ستمبر ۱۹۵۳ء کی روئیداد اور اہم مذاکرات کا اردو میں ترجمہ کر کے طلوع اسلام میں اشاعت کیلئے ارسال فرمایا ہے۔ اس میں سب سے پہلے ان مذاکرات کا خلاصہ ہے جو منتظمین کی طرف سے شائع ہوا ہے اسکے بعد حسب ذیل مذاکرات ہیں:۔

(۱) زوالِ امتِ مسلمہ اور اس کی نشاۃ ثانیہ ——— ڈاکٹر صبحی

(۲) مملکت ترکیہ میں شرعی قوانین میں ردوبدل ——— پروفیسر تیور

(۳) شریعت اسلامیہ اور دنیوی اصول پر قانون سازی ——— پروفیسر مجید

[چوتھی تقریر یمن کے شیخ محمد الحجری الیمنی کی تھی۔]

ہم ان تراجم کو محترم انصاری صاحب کے شکریہ کے ساتھ شائع کرتے ہیں۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ مسلمانانِ پاکستان کو یہ معلوم ہو سکے کہ اس وقت ان قوانین شریعت کے متعلق جو مسلمانوں میں عام طور پر رائج ہیں مختلف اسلامی ممالک کے اربابِ فکر و نظر کا کیا خیال ہے اور ان کے ذہنی رجحانات کیا ہیں۔ اس سے آپ یہ بھی اندازہ لگائیں گے کہ زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات کس طرح اس جمود کو توڑ دیتے ہیں جسے انسانوں کے خود ساختہ تقدس نے قابل پرستش شے بنا رکھا ہوتا ہے۔ یاد رکھئے یہ خصوصیت کبریٰ صرف خدا کے دیئے ہوئے قوانین ہی کو حاصل ہے (جو قرآن کے اندر محفوظ ہیں) کہ وہ اپنی جگہ محکم اور ثابت رہتے ہوئے زمانہ کے بڑھتے اور بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دیتے جاتے ہیں۔　　طلوع اسلام]

(۱)

شرع اور نظامِ قانون کی تجدید پر عام مباحثہ

عام مباحثہ زیادہ تر دو مسائل ہی پر ہوتا رہا یعنی اجتہاد کا دروازہ جو بند کر دیا گیا ہے پھر کھول دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ شرع اسلامی کو معاشرتی زندگی اور قومی کردار کی ساخت میں کہاں تک دخل حاصل ہو۔ ترکی کے مقنن اس پر زور دے رہے تھے کہ ان کے تجربہ کے لحاظ سے شرع اور دنیوی قانون کے بین بین کسی راستہ کا

اختیار کرنا ممکن العمل نہیں ہے۔ وہ اور ان کے ہم خیال اصحاب اصلاح کی معقولیت کی پیروی میں ایک ایسا موقف اختیار کرنے پر مجبور ہوئے جس میں شریعت کو قوم کی اجتماعی زندگی منضبط کرنے والی اساس کی حیثیت نہ دی گئی ہو۔ مطلب یہ ہوا کہ مذہب اسلام صرف ذاتی عقیدہ کی حیثیت سے برقرار رہ کر قوم کی معاشرتی زندگی میں روح تو پھونک سکے لیکن اس کی وضع قطع کو ڈھالنے کی کوشش نہ کرے۔ نمائندگان کی اکثریت اس سے متفق نہ ہو سکی اور وہ اس پر اصرار کرتی رہی کہ اسلام ایک طریق زندگی اور ضابطہ حیات ہے جس کے بنیادی اصول قرآن اور حدیث میں بتلا دیئے گئے ہیں اور جن کا بدلتے ہوئے زمانوں کی رعایت کے ساتھ اطلاق ہوتا رہے گا اور اسی لحاظ سے معاشرتی طور و طریق بھی متعین ہوتے رہیں گے مگر اس کا قالب کسی صورت میں بھی بہرحال اس سے مختلف نہ ہوگا جو انسانوں کی حیات اجتماعی کیلئے اللہ نے بذریعہ وحی مقرر کیا ہے۔

کانفرنس کے نمائندے "اجتہاد" کے صحیح اور جائز استعمال پر بھی بہت کچھ رد و قدح کرتے رہے اور اس پر بھی غور ہوا کہ کس حد تک اس کی آزادی دی جا سکتی ہے۔ جب اجتہاد از روئے قانون واجب نہ ہو بلکہ صرف اس کے جواز ہی پر زور دیا جائے تو زمانہ حال کے مقنن کیلئے تعدد ازدواج، سزائے سرقہ و زنا وغیرہ کی قسم کے مسائل میں قرآن کے صاف و صریح احکام کے سامنے بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ اس نازک معاملہ میں باوجود اس عقیدہ کی قطعیت کے کہ مذہب اسلام عبد و معبود کے رشتہ کی اساس ہونے کے علاوہ من حیث المجموع ایک مکمل ضابطہ حیات بھی ہے شدید اختلاف آرا پایا گیا اور مصالحت و اتفاق کی کوئی صورت نہ نکل سکی۔ اسی طرح شرع اسلامی کو دنیوی اساس پر لانے اور مذہب اور روزمرہ زندگی کے معاملات کو الگ الگ رکھنے کے سوال اور آئے دن کے بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت پیدا کر لینے کی صلاحیت ایک دلچسپ و طویل بحث کا موضوع رہی۔ اکثر و بیشتر یہ واضح کرنے پر زور دیا گیا کہ اسلام ایک مذہب بھی ہے اور معاشرہ بھی، جس کی حیثیت طور و طریق تمدنی بھی ہیں اور بہرحال بہترین ہدایتوں سے بہرہ مند، جو قرآن شریف میں مدون کر دی گئی ہیں۔ مسلمان ہمیشہ اس کی پیروی میں ساعی رہے اور رہنا چاہتے ہیں لیکن اگر وہ نصب العین تک پہنچنے میں ناکام رہے ہیں تو یہ ان کی بشری خامیاں ہیں، اس سے مذہب پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اگر آج کا مسلمان حقیقی اسلام کا نمونہ نہیں پیش کرتا تو اس سے اسلام کی خوبیوں کا اندازہ کرنا ہر آئینہ غیر صحیح ہی ہوگا۔

بعض لوگوں کی رائے یہ بھی کہ شریعت اسلامیہ کو دنیوی اساس پر ڈھالنے کی کوشش ہی سرے سے غلط ہے۔ اکثر مقررین نے زور اس پر دیا کہ اسلام کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ بدلتے ہوئے حالات میں بھی مفید و کارگر ہونے کی صلاحیت شرع میں موجود ہے اور زمانہ حال کے معاملات و مسائل میں بھی اس سے رہبری حاصل کی جا سکتی ہے۔ پس کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ یہ رہنمائی کیونکر حاصل کی جائے اور اس کا بندوبست کیا ہو۔ اس مسئلہ کے تعلق سے پاکستان ان دنوں ایک بڑی الجھن میں مبتلا ہے۔ وہاں ایک کمیٹی مقرر کر دی گئی ہے تاکہ ان ذرائع و وسائل کا مطالعہ کرے جن سے تمام قانون سازی اسلامی اصولوں کے مطابق کی جا سکے۔ سارا عالم اسلام بڑی گہری دلچسپی سے اس کے نتائج کا منتظر ہے۔

مجلس کے بحث و مباحثہ میں یہ بھی واضح ہوا کہ باوجود روایاتی عقائد کے بجز یمن اور سعودی عربستان تمام مسلم ممالک نجی (پرسنل) امور کے علاوہ بقیہ تمام معاملات کے لئے مغربی قوانین کی اساس ضروری ترمیمات کے ساتھ قبول و منظور کر چکے ہیں اور یہ ان کی پختہ رائے ہے کہ یہ طریق کار تمدن کی ایک قدرتی نوعیت ترقی ہے اور چونکہ یہ اصول اسلام کے مغائر نہیں اسلئے یہ تصور کرنا بیجا نہ ہوگا کہ اس منتقلہ رائے کو شرعی "اجماع" کی حیثیت حاصل ہے۔ بعض حلقوں میں اپنے روایاتی اور مذہبی ورثہ کی از سر نو تعبیر کرنے کی اہمیت تسلیم کرتے ہوئے اس کے ساتھ چمٹے رہنے پر بھی

بہت کچھ زور دیا جاتا رہا۔ اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی کہ قرآن، مستند احادیث اور شرع کی ظاہری و معنوی ہر دو طریق سے از سرِ نو تعبیر ہو تو زمانہ حال میں بھی اس سے استفادہ اور ہدایت حاصل کی جا سکتی ہے۔ بلاشبہ ایسے بھی بہت سے احکام شرع اور اسلامی طور و طریق ہوں گے جو جائز سہی لیکن فی زمانہ بیکار ہیں انھیں چھوڑ دینے میں کوئی ہرج نہیں۔ مثال کے طور پر اشیائے قابل بیع و شریٰ کی قیمت کے تعین کے طریقے کو لیجئے۔ اب نہ اس کی ضرورت ہے اور نہ ہی اس پر عمل ہو سکتا ہے۔

اقوام اسلامی کے اتحاد پر بھی بحث ہوئی اور اس میں جو دشواریاں لاحق ہیں ان پر بھی غور کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ اس باب میں قومی خودداری کے علاوہ اختلاف عقائد بھی بڑی حد تک مانع ہے۔ مثلاً خلق قرآن کے مسئلہ پر معتزلہ کے اور شیعہ سنی علما کے مابین سخت اختلاف ہے پھر خود شیعہ سنی دونوں کے مابین مسئلہ خلافت و امامت کے تعلق سے دیرینہ نزاع چلی آ رہی ہے۔

الحاصل یہ دلچسپ مباحثہ اس رائے پر زور دیتے ہوئے ختم ہوا کہ مسلمانوں کو اسلام پیش کرتے وقت اس کے ایمانی اصول اور روحانی و اخلاقی پہلوؤں ہی پر زور دینا چاہیئے، فروعات، شعائر اور مدنی طور و طریق ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ تھا کانفرنس کی ۱۴ ستمبر کی روئداد کا خلاصہ جو منتظمین کی طرف سے شائع ہوا۔ اس کے بعد ہم ان تقاریر کا ترجمہ پیش کرتے ہیں جو اس موضوع پر کانفرنس میں ہوئیں۔ سب سے پہلے بیروت یونیورسٹی کے پروفیسر صبحی کی تقریر دیکھئے۔

(۳)

زوالِ امتِ مسلمہ اور اس کی نشاۃ ثانیہ۔ اسلامی شرع اور زمانہ حال کی تمدنی ضروریات،

کے عنوان پر ڈاکٹر صبحی صاحب پروفیسر شرع اسلامی بیروت یونیورسٹی کی افتتاحی تقریر

مشرق اور مغرب ایک دوسرے سے قریب تر اور ان کے باہمی تعلقات و روابط دن بدن زیادہ گہرے ہوتے جا رہے ہیں اور آئے دن بین الاقوامی طریق حیات کے میلانات خاص کر جمہوریت و اشتراکیت کے مابین جو ایک وسیع خلیج حائل ہو رہی ہے چونکہ اس کو صرف اسلامی نقطۂ نظر ہی سے پاٹا جا سکتا ہے اور اسی سے دونوں نظریوں میں ہم آہنگی و توافق پیدا کیا جا سکتا ہے۔ نیز چونکہ اسلام ایک طرف ذاتی جائیداد کے حق اور انفرادی آزادی کا حامی ہے اور دوسری طرف اصولِ مساواتِ انسانی اور مفادِ عامۃ الناس کے مقتضیات کو بھی نظر انداز نہیں کرتا، اس لئے ثقافت اسلامی کے مطالعہ کو آج کل ایک خاص اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ لیکن افسوس ہے خود مسلمانوں کی حالت کچھ دگر گوں ہے اور وہ خود کوئی اچھا نمونہ نہیں پیش کرتے۔

مستشرقین ہی نے نہیں بلکہ مسلم مفکرین نے بھی خواہ وہ قدامت پرست ہوں یا روشن خیال، ثقافت اسلامی کے موضوع پر بہت کچھ خامہ فرسائی کی ہے لیکن جہاں تک ہمارے روشن خیال حضرات کا تعلق ہے یہ ایک امر واقعہ ہے کہ ان کی نظروں میں مسلمانوں کی اصلاح کا تصور اور ان کی کوشش کا میلان یہ ہے کہ پھر سے ماضی کی طرف جاؤ اور اپنی خالص تعلیمات مذہبی یعنی مذہب سلف الصالح کو پھر بحال کرو۔ بالفاظِ دیگر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنی اصلاح کیلئے اسلام کے ان ابتدائی اصولوں ہی سے رہبری حاصل کرنی چاہئے

جو کلام اللہ اور احادیثِ نبوی میں مدون ہو چکے ہیں۔ رہ گئیں ائمہ کی شخصی رائیں اور فتاوے سو ان کا مشورہ یہ ہے کہ جدید معاشرہ کی ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے اسلام کے ابتدائی اصولوں کی روشنی میں ان کی از سرِ نو تعبیر ہونی چاہیئے۔

اس مختصر تمہید کے بعد میں ان علل و اسباب پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں جو میری ناچیز رائے میں امت مسلمہ کے زوال کا باعث ہوئے ہیں۔

اجتہاد سب سے پہلا اور خالص سبب ہمارے زوال کا علم و تعلیم سے ہماری غفلت اور بیگانگی ہے اور یہ غلط تصور کہ اب ذاتی فکر و تعبیر اور اجتہاد کا زمانہ نہیں رہا لیکن آپ جانتے ہیں کہ اسلامی شریعت کہئے یا فقہ مذہب اور قانون ہر دو پر یکساں جاری ان دونوں کا باہمی تعلق فکرِ اسلامی پر اس قدر اثر انداز ہوا ہے کہ شاید ہی مسلمانوں کی زندگی کا کوئی گوشہ اس سے اثر اندوز ہوئے بغیر رہا ہو۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ اسلامی اصولِ قانون کے سرچشمے یا ماخذ دو قسم کے ہیں اول قرآن شریف اور حدیثِ نبوی کے مقدس احکام جو ایک خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ دوسری قسم کے ماخذ ثانوی حیثیت رکھتے ہیں اور ان میں اجماع یعنی فقہاء کی متفقہ آراء اور قیاس کو بھی داخل کیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ مصلحت اور رواج جنھیں مذہب حنفی کی اصطلاح میں 'استحسان' اور مذہب مالکی میں 'مصالح المرسلہ' سے موسوم کیا جاتا ہے اسی شق کے تحت آجاتے ہیں۔

قانونِ اسلامی کے ان سرچشموں کا مطالعہ ایک خاص علم کا موضوع رہا ہے جسے 'علم الاصول' کہتے ہیں اور اسی سے وہ اسلوب فکر وجود میں آیا ہے جسے اجتہاد سے موسوم کیا جاتا ہے یعنی ماخذ قانون کی تعبیر کی کوشش اور مذہب اور قانون سے متعلق عملی مسائل کا مناسب حل دریافت کرنے کی جدوجہد، تمدنی ضروریات اور قواعد و احکام میں موزونیت و مطابقت پیدا کرنے میں بھی اجتہاد نے ایک اہم طبقہ کی حیثیت سے کام کیا ہے خصوصاً خلفائے عباسیہ کے عہد میں جبکہ اجتہاد کی نسبتاً زیادہ آزادی تھی اسلام کے اصولِ قانون کو اس کی بدولت بہت عظمت و فروغ حاصل ہوا تھا لیکن تیرھویں صدی عیسوی میں سقوط بغداد کے بعد جبکہ ثقافتِ اسلامی کی ضیا پاشیاں ماند ہو گئیں راسخ العقیدہ سنی فقہاء اس رائے پر متفق ہوتے گئے کہ موجودۃ الوقت چار مذاہب سنت جماعت یعنی حنفی، مالکی، شافعی و حنبلی ہی آئندہ کیلئے کافی ہیں اور مزید جدوجہد اور بحث و تمحیص کچھ سودمند نہیں گویا اس طرح انھوں نے اجتہاد کا دروازہ بند اور نئی تعبیر کی راہیں مسدود کر ڈالیں نتیجہ اس ذہنیت اور طریق کار کا سوائے اس کے اور کیا ہوتا کہ کورانہ تقلید اور غلامانہ پیروی مسلمانوں کا عام شعار ہو گئی ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے بعد سے قانون اسلامی میں کورانہ تقلید کے ہاتھوں ساری امت کے قوائے عقل و فکر معطل ہوتے گئے اور ایک عام جمود طاری ہو گیا۔ مجھے اس خرابی کی اصلاح کی یہی صورت دکھائی دیتی ہے کہ اجتہاد پر سے پابندیاں اٹھائی جائیں اور ذاتی تعبیر اور جدوجہد کی پوری آزادی ہو۔ چنانچہ ابن تیمیہ، ابن قیم الجوزی، محمد بن عبدالوہاب، جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ جیسے مصلحان اہل سنت و علمائے شیعہ نے اپنے اصلاحی پروگراموں میں اسی پر زیادہ زور دیا ہے۔ یہ تمام مصلحین و مقننین وہ ان کے پیرو اس پر زور دیتے آئے ہیں کہ اجتہاد مسلمانوں کیلئے نہ صرف جائز بلکہ فرض متصور ہونا چاہیئے اور کورانہ تقلید گمراہی و معصیت کاری لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ حق اجتہاد کا استعمال ہر کہ و مہ کا کام نہیں۔ ایک اجتہاد کرنے والے مقنن میں بعض خاص اوصاف لازماً ہونے چاہئیں از انجملہ ایک علم و فضل ہے جو از روئے اسلام اجتہاد کی شرط مقدم ہی نہیں بلکہ قرآن و حدیث کی رو سے ہر مسلمان کا فرض بھی ہے پس دینائے اسلام کی عقل و فکر کو اگر قید و تعطل سے آزادی دلانا ہے تو اجائے حقِ اجتہاد کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم علم و تفقہ سے آراستہ ہوں۔

اسی صلاحیت اور آزادیٔ فکر و خیال سے ثقافتِ اسلامی میں پھر سے چار چاند لگ جائینگے اور شریعتِ اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ ظہور میں آجائیگی۔

احادیث دوسرا بڑا سبب ہمارے زوال کا یہ ہے کہ ہم موضوع اور غلط حدیثوں کو بھی مانتے اور ان پر عمل کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اسلامی اصولِ قانون میں نص یعنی حکم صریح میں آیاتِ قرآن کے علاوہ حدیثِ پیغمبر بھی داخل ہے۔ اس حد تک تو سب کو اتفاق ہے کہ زمانہ حیاتِ رسول مقبولؐ ہی میں بحکم و ہدایت آنحضرتؐ قرآن شریف کی کتابت تمام و کمال ہو چکی تھی البتہ اس کی موجودہ ترتیب و تبویب زیر ہدایت حضرت ابوبکر صدیقؓ و حضرت عثمانؓ عمل میں آئی[1]۔ جہاں تک کلام اللہ کا تعلق ہے یہ حقیقت ہے کہ اس کی تمام آیات کی صحت سارے مسلمانوں کے نزدیک ہمیشہ متفق علیہ رہی اور اب بھی اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ لیکن اس نہج پر حدیث نبویؐ کی ترتیب و تدوین عمل میں نہیں آئی تھی ہی نہیں بلکہ خود ایک حدیث کی رو سے تحریر و تدوینِ حدیث ہی کو ممنوع قرار دیدیا گیا تھا۔ خلیفہ ثانیؓ اس پر شدت سے عمل پیرا رہے کیونکہ انھیں اندیشہ تھا کہ مبادا احادیث کو ناواجبی اہمیت حاصل ہو جائے۔ اور مسلمان احکامِ قرآن ہی سے صرفِ نظر کرنے لگیں۔ یہی وجہ ہے کہ خلفائے عباسیہ کے عہد تک ہماری مشہور کتبِ احادیث کی تدوین نہ ہو سکی۔ اگرچہ علمائے حدیث اور فقہائے علم الحدیث کے نہایت سخت قواعد اور معیارِ تنقیح مقرر کئے۔ اس کے باوجود کوئی مستند مجموعۂ حدیث نہ ہونے کی وجہ سے بہت سی ضعیف اور موضوع روایتیں اور حدیثیں رواج پا گئیں۔ اس قباحت کا فتنہ ظاہر ہے۔ ان ہی کی وجہ سے مختلف مکاتبِ فقہ معرضِ وجود میں آئے اور ایسے ایسے احکام و مسائل رواج پا گئے جو معقولیت کے خلاف اور مسلمانوں کی صلاح و فلاح کے مغائر تھے اور زوالِ امت مسلمہ کا باعث بن گئے۔

یہ خرابی اس طرح دور کی جا سکتی ہے کہ نہایت غور اور تحقیق کے ساتھ دفترِ احادیث کی جانچ کی جائے۔ تمام موضوع اور غیر مستند حدیثوں کو رد کر دیا جائے اور صرف ان حدیثوں کا مجموعہ تیار کیا جائے جن پر تمام مذاہبِ اسلامیہ متفق ہیں اور مستند مانتے ہیں۔ ایسا مجموعہ ہی سب کیلئے قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔ رہیں دوسری حدیثیں تو انھیں صرف اسی صورت میں تسلیم کیا جائے جب وہ عقلی معیار پر بھی پوری اتریں چنانچہ علامہ ابن تیمیہؒ صحت و تحقیقِ حدیث کا اس کے سوائے کوئی اور معیار مانتے ہی نہیں۔

فقہ ایک اور سبب ہمارے زوال کا یہ بھی ہے کہ ہم خواہ مخواہ فروعی باتوں اور پرانے طور و طریق اور دیرینہ شعار کو سینہ سے چمٹائے ہوئے ہیں اور انھیں ایک ناواجبی اہمیت دے رکھی ہے۔ اسلامی شرع میں ایسے قوانین اور احکام جو نصِ[2] قرآن پر مبنی ہوں بہت تھوڑے اور محدود ہی ہیں۔ شریعت میں تو زیادہ تر ایسے احکام ہیں جنھیں علما و فقہا نے ذاتی رائے سے مرتب کیا ہے۔ قرآن[3] میں تو صرف بنیادی اصول ہی بتائے جا سکتے تھے اسلئے مفصل قواعد اور فروعی تفصیلات کو تفقہ قانونی اور اجتہاد پر چھوڑ دیا گیا جسے اجماعِ امت، قیاس اور عام اصول مودلت جیسے ثانوی ماخذوں سے خوشہ چینی کرنی ہوتی ہے۔ یہ فروعی احکام اور تفاصیل استفتا اور جوابات کے ذخیروں اور ان گنت تصانیفِ فقہا یا ان کی شرحوں کے انبار کی صورت میں پائے جاتے ہیں۔

کیا بدبختی ہے کہ مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ بالخصوص کورانہ تقلید اور اندھا دھند پیروی کے دور میں ان فروعی احکام و تفاصیل نے ایسی اہمیت حاصل کر لی کہ خود بنیادی اصول اس انبار کی تہ میں پوشیدہ ہو گئے۔ یہ تو ہونا ہی تھا مگر ان کے مطالعہ سے ایک قسم کی ظواہر پرستی بھی پیدا ہو گئی جو شریعت اسلامی کی روح کے بالکل مغائر تھی اور جس کا قرآن[4] کے معنی و مطالب سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ چنانچہ وضو، غسل و

---

[1] یہ غلط ہے قرآن کریم اپنی موجودہ ترتیب کے مطابق خود آنحضرتؐ کے زمانہ میں مکمل ہو چکا تھا۔ (طلوع اسلام) [2] اصل تقریریں (SACRED TEXTS) کے الفاظ ہیں۔

طہارت، لین دین، معاہدہ کی آزادی اور نیت وغیرہ کے مسائل میں فکر اسلامی کے اس مرض مہلک کے آثار و علائم اچھی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ ورنہ ان معاملات اور اس قسم کے دوسرے مسائل میں بنیادی اصول و احکام نہایت سیدھے سادے اور غیر رسمی تھے۔ لیکن تفصیل قواعد سازی میں وہ وہ بال کی کھال نکالی گئی اور حاشیے چڑھائے گئے کہ اصل اصول ہی مسخ ہو کر رہ گئے گویا یہ ذیلی قواعد اور فروعات ہی مذہب کا اصول اور اس کے روح رواں تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فروعات ظواہر ہی کی غلامانہ پابندی ہونے لگی اور اصل اصول پس پشت جا پڑے۔ فقہ اسلامی کے اس مرض کا مداوا اس طرح ہو سکتا ہے کہ زور صرف بنیادی اصولوں ہی پر دیا جائے اور ان تمام خواہ مخواہ کی رایوں اور فتاووں کو خیرباد کہہ دیا جائے جن سے شرع کے بنیادی اصول زیر نقاب ہو گئے ہیں۔

فرقہ پرستی فرقہ واری تعصب بھی ایک باعث ہمارے زوال کا ہے۔ یہ بدقسمتی ہے کہ مسلمانوں میں جہاں آزادیِ فکر و خیال اور اجتہادِ ذاتی کے جواز کو فروغ اور اہمیت کا شرف حاصل ہوا ساتھ ہی ساتھ مذاہب فقہ اور مکاتبِ قانون کی بھی کثرت ہو گئی۔ سب سے زیادہ بدبختانہ فرقہ بندی شیعہ سنی کی تھی۔ سنت و روایات رسول اللہ صلعم کی سند کا قبول کرنے والا پہلا گروہ سنی کہلایا۔ سند کے بارے میں سنت پر عقیدہ ان کی خصوصیت تھا۔ مسلمانوں کی اکثریت اسی گروہ سے وابستہ ہے اور ان کے زیادہ مشہور مذاہب فقہ حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی ہیں۔ دوسرے گروہ یعنی شیعہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ مسئلہ خلافت میں وہ حضرت رسول اکرمؐ کے برادر عزاد و داماد یعنی حضرت علیؓ کے حمایتی اور طرفدار تھے شیعانِ علی کہلائے۔ یہ حضرت علیؓ ہی کو بعد وفات رسول اکرمؐ جانشینی اور خلافت نبوی کا حقدار تصور کرتے ہیں اور پہلے تین خلفاء کے حق و استحقاق کے منکر ہیں۔ ان کے خاص مذاہب امامیہ، زیدی اور اسماعیلی ہیں۔

مکاتبِ فقہ کے اختلاف شرع کے میدان میں مکاتب فقہ کے باہمی اختلاف کے وجوہ حسب ذیل ہیں۔

بعض آیاتِ قرآنی کے مفہوم اور تعبیر کا اختلاف اور پھر چند حدیثوں کے اسناد پر متفق نہ ہو سکنا۔ یا قانون کے بعض ماخذوں کا انکار، مثلاً قیاس و استحسان کا متفق علیہ نہ ہونا۔ اسی طرح دوسری صورتوں میں نظری و تعبیری اختلافات وغیرہ۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ پیش نظر رکھنا بھی اہم اور ضروری ہے کہ مختلف مکاتب کے مابین جو بھی اختلافات ہیں وہ بنیادی اور اصولی نہیں۔ کیونکہ اصول و عقائد اور تصورات کی حد تک سب متفق ہیں فرق اگر پڑتا ہے تو صرف فروعات اور ذیلی قوانین میں اور یہ زیادہ تر اصولِ شرع کو عملی معاملات کے ساتھ منطبق کرتے وقت پیدا ہوتا ہے۔

بایں ہمہ خرابی کثرتِ مکاتبِ فقہ سے ایک فائدہ بھی ضرور ہوا مثلاً اگر کسی ایک مسئلہ پر کہیں شدت اور سختی برتی گئی ہے تو دوسرے مکتب میں رعایت اور نرمی کا پہلو بھی مل جاتا ہے۔ اس سے اسلامی شریعت کی نشو و نما میں ایک قسم کی لچک اور پائیدگی پیدا ہو گئی۔ بس اس ایک فائدے کے علاوہ کثرتِ مکاتبِ فقہ نتیجۃً مضر ہی رہی۔ اس قباحت نے فرقہ وارانہ گروہ بندی اور شدید تعصب کو جنم دیا جس کے باعث مختلف فرقوں کے مابین منافرت اور نزاعات و مناقشات کا دروازہ کھل گیا۔ نفاق و شقاق پھیلا۔ یکجہتی و یگانگت رخصت ہو گئی، قوت گھٹی اور مسلمانوں کے زوال کی تحریک نے زور پکڑا۔

وحدت کی صورت اسی فساد کو رفع کر کے مختلف مکاتبِ شرع اسلام کو پھر ایک مرکز پر لانے کیلئے حسب ذیل مشورے دیئے جاتے ہیں۔

اوامر و نواہی یعنی احکامِ قرآن اور ان احادیث کو جو سب کے نزدیک مسلمہ ہیں اور جن کی سند میں کوئی شبہ نہیں ہے عمل اور پابندی کیلئے علیحدہ کر کے ایک جگہ کر لیا جائے اور دوسری حدیثوں اور روایتوں کی اسی صورت میں پابندی کی جائے جبکہ وہ عقل و فہم کے مغائر نہ ہوں۔ اس کے ساتھ ہی صرف ایسے اجتہادی نظریاتِ قانون اور مسائل کو تسلیم کیا جائے جو زمانہ حال کی ضروریاتِ تمدن کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں اور جو عدل و انصاف کی بنیادوں پر قائم ہیں اور مفادِ عامہ سے متعارض نہیں ہوتے۔ چنانچہ ہمارے مصلح اور ریفارمر بھی وقتاً فوقتاً مکاتبِ فقہ کی یکسانیت کی حمایت کرتے اور اس پر زور دیتے رہے ہیں کیونکہ یہ اصولِ کار اس اسلامی اسپرٹ کے عین مطابق ہے جو نہ صرف مسلمانوں کے بلکہ تمام بنی نوع انسان کے اتحاد و یگانگت کی آرزومند ہے چنانچہ کلام اللہ میں ایک موقعہ پر حضور ختمی مرتبتؐ کو مخاطب فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (۶/۱۵۹)

بیشک جن لوگوں نے اپنے دین میں فرقے بنائے ہیں اور گروہ بن گئے ہیں اے نبی تم ان کی کسی بات میں شریک نہیں ہو۔

تحقیقی مطالعہ پھر احکام شرعی کے علل و اسباب کے تحقیقی مطالعہ کا فقدان بھی کچھ کم ہماری حالت پر اثر انداز نہیں رہا ہے۔ اس حقیقتِ واقعی کے مدنظر کہ انسان کی اغراض و خواہشات ہی محرک اور بنیاد ہوا کرتی ہیں اعمال کی اسلامی قانونِ معاملات میں بھی اسے نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے احکام سماجی ماحول اور زمانہ کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ تغیر پذیر ہوتے رہیں گے۔ پس ایسے قواعد شرعی کی حد تک جو آیاتِ مقدسہ یا احادیث مستند پر مبنی نہیں ہیں فقہا نے بھی اس اصول کو بلا چون و چرا تسلیم کر لیا ہے۔ اور جہاں تک ان احکام کا تعلق ہے جو آیاتِ قرآن یا احادیث و سننِ مستند پر قائم ہیں اکثر خلفا اور فقیہوں نے حسب ذیل صورتوں میں ذاتی اجتہاد اور ائمہ کرام کی رائے سے اختلاف کی اجازت دی ہے۔

الف: اغراض مفادِ عامہ کے لئے

ب: جبکہ اصل غایت یا موثر علت کسی حکم یا قاعدہ کی باقی نہ رہی علم الاصول یعنی شرع اسلام کے ماخذوں کے مطالعہ کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ ہر قاعدۂ قانونی یا حکم کسی نہ کسی غایت یا موثر علت پر مبنی ہوتا ہے اور وہ اس وقت تک موثر اور قائم رہے گا جب تک اس کی علت غائی باقی ہے۔ مثال کیلئے ایک ایسے معاملے میں حضرت عمرؓ کا ایک عمل دیکھ لیجئے۔ صدقات و خیرات کا کچھ حصہ حکم قرآن کی ہدایت پر بعض سرداران قبائل کو تالیف قلوب کی غرض سے دیا جا رہا تھا۔ پہلے پہلے مسلمان قلیل التعداد اور کمزور تھے اور دشمن کثیر و قوی۔ اسی لئے مسلمانوں کے تحفظ اور بقا اور عام اغراض اسلام کا اقتضا یہ تھا کہ با اثر قبیلوں کی امداد و اعانت اور حمایت حاصل کی جائے مگر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں صورت حال بالکل بدل گئی۔ اب مسلمانوں کی یہ احتیاج باقی نہ رہی اور تالیف قلوب کا مد بھی غیر ضروری ہو گیا اور باوجودیکہ اس کی ابتدا ایک حکم قرآنی سے ہوئی تھی خلیفہ ثانیؓ نے اس کو آئندہ جاری رکھنا ضروری نہ سمجھا۔

ج۔ جب کوئی قاعدہ یا حکم قانونی بالکلیہ رسم و رواج اور عمل دیرینہ پر مبنی ہوتا ہے تو چونکہ رسم و رواج مرورِ زمانہ کے ساتھ تغیر پذیر ہوا کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے احکام کو بھی نئے رسم و رواج کی مطابقت کے لئے بدلنا ہوگا۔ مثلاً ایک مرتبہ غلہ کے ناپ تول کے

بارے میں حضور اکرمؐ نے ارشاد فرمایا تھا کہ غلہ کی پیمائش ماپ یعنی پیمانہ سے کیا کرو کیونکہ اس زمانہ میں اس طریقہ کا عام رواج تھا اور یہی مستحسن تصور کیا جاتا تھا لیکن بعد کے زمانہ میں یہ تجارتی طریقہ بدل گیا۔ ماپ کا استعمال متروک ہو گیا اور غلہ کی پیمائش وزن کے لحاظ سے ہونے لگی اور یہ سوال پیدا ہوا کہ حدیث پر عمل کیا جائے یا عام رواج و دستور پر۔ بغداد کے صدر الصدور ابو یوسف سے جو حنفی المذہب تھے استفتا کیا گیا تو انھوں نے قرار دیا کہ سنت ایک پرانے رواج پر مبنی تھی، رواج بدل گیا ہے اور وزن کے ذریعہ پیمائش معتبر و مستحسن سمجھی جاتی ہے اس کے جواز میں شبہ نہ ہونا چاہیئے۔ بہرحال اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلامی قانون اٹل اور بے لچک نہیں۔ اور نہ زمانہ حال کی ضروریات کے لحاظ سے نئے قانون بنانے یا پرانے قوانین میں ترمیم کرنے کی اسلام نے کوئی ممانعت کی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے مسلم فقہا اس کلیہ کو جو مسلمہ اسناد پر مبنی ہے اپنے زمانۂ زوال میں بالکل بھلا بیٹھے اور علم اصول قانون کے مطالعہ سے عام مسلمانوں میں لاپرواہی برتی جانے لگی اس سے ثقافتِ اسلامی کی نشوونما ٹھٹک کر رہ گئی۔ میرے خیال میں اس خرابی کو یوں دور کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی اصول قانون کی اسپرٹ کو اجاگر کر کے اس کے کارفرما اصولوں کو پھر ذہن نشین کرایا جائے۔ کیونکہ ان اصولوں کے احیاء ہی پر ہماری ثقافت کی نشاۃ ثانیہ کا دارومدار ہے۔

معاشرتی امور ایک اور اہم سبب ہمارے زوال کا یہ ہے کہ ہم نے مذہب اور دنیاوی امور میں خلط مبحث پیدا کر رکھا ہے کہ وہ مذہب اور قانون دونوں پر ایک ساتھ غور کرتا ہے۔ اسی خصوصیت کا اثر ہے کہ مذہبی و اخلاقی تعلیمات اور احکام قانون الگ الگ رہ کر بھی ایک دوسرے پر یکساں اثر انداز ہوتے ہیں۔ گو یہ صحیح ہے کہ فقہا نے بعض اوقات مذہبی فتاوٰی اور قانونی فیصلوں میں امتیاز برتا ہے مثلاً طلاق کو لیجئے جواز روئے مذہب صرف معقول وجوہ ہی پر دی جا سکتی ہے لیکن ایسا فرق و امتیاز ہمیشہ صاف اور واضح بنیادوں پر نہیں رہ سکا اور زمانۂ زوال کے فقہا نے مذہبی احکام اور ضمنی مسائل اور احکام اخلاقی کو خلط ملط کر کے دونوں کو ایک ہی حیثیت دیدی ہے۔ یہانتک کہ مسائل دنیوی کو بھی مثل عقائد مذہبی وہ اٹل اور ناقابل تغیر قرار دینے لگے نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ہر نئی بات ممنوع اور ہر تبدیلی بدعت قرار پائی۔ مثال کے طور پر دیکھئے کہ بعض فقہا فرنگی ٹوپی کا اوڑھنا غیر زبانوں کا سیکھنا اور چھری کانٹے سے کھانا بدعت اور معصیت کاری میں داخل سمجھتے ہیں۔ اس تنگ خیالی سے ایک مذموم کٹرپن پیدا ہو چلا ہے اور تمدنی ترقی میں رکاوٹ اور فکر اسلامی میں جمود طاری ہے۔

یہ ساری باتیں اسلامی اصول شرع اور اس کی اسپرٹ کے مغائر ہیں۔ اس کے برعکس آزاد مسلک کے مسلم فقہا کا خیال ہے کہ معاملات دنیوی سے متعلقہ حدیثوں کو احکام محکم کی حیثیت نہ دینی چاہیئے۔ اسکی تائید میں وہ خود حدیث نبوی ہی سے استدلال کرتے ہیں۔ روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت رسالت مآبؐ کا ایک نخلستان پر سے گذر ہوا جہاں مزارعین تلقیح اشجار کے عام مروجہ طریق پر افزائش پیداوار کا بندوبست کر رہے تھے۔ ارشاد ہوا کہ ایسا نہ کیا جائے تب بھی کھجوریں نشوونما پائیں گی اور اسی طرح بالیدہ اور شیریں ہوں گی۔ اس اظہار خیال اور ہدایت کے مدنظر مزارعین نے اپنا طریقۂ کاشت بدل دیا اور نخلستان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا لیکن اس سال کی فصل بالکل خراب ہو گئی اور پیداوار کم۔ حضور اکرمؐ کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو ارشاد ہوا کہ آخر میں بشر ہی ہوں۔ یہ ایک بالکل دنیوی معاملہ ہے۔ میں اگر دین سے متعلق کوئی ہدایت کروں تو اس کی تعمیل تمہارا فرض ہے لیکن امور دنیوی میں اگر کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا میں مشورہ دوں تو تم اپنی عقل اور

تجربہ سے بھی کام لینے سے ممنوع نہیں ہو۔ یہ فراموش نہ کرو کہ میں ایک انسان ہی ہوں اور شاید دنیوی معاملات کو تم مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہو۔

اسلام کا تعلق اساسی طور پر دین سے اور اس ضابطۂ اخلاق سے ہے جو دین سے وابستہ ہے۔ دنیا کے معمولی کاروبار و معاملات کو اس نے خود مسلمانوں ہی پر چھوڑ دیا ہے۔ پس حدیث اور سنن نبویؐ کے مطالعہ کے وقت اسے ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیئے خصوصاً جبکہ ہم مالکِ اسلامیہ کے قوانین کی اصلاح اور ترمیم پر غور کر رہے ہوں اور یہ فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ فرائضِ دین اور معاملاتِ دنیا دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں، گو ان دونوں کا اصول کار فرما ایک ہی کیوں نہ ہو۔

یہ ہے خلاصہ اسلامی شریعت کے موجودہ ضعف اور امت مسلمہ کے زوال کے اسباب کا۔ ان علتوں کی اصلاح کی تدبیریں ثقافتِ اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کی شرائط و ضروریات کا ملخص یہ ہے کہ علم و فضل کا شوق ہو، اجتہاد، فکر کی آزادی ہو۔ غلط اور موضوع حدیثوں سے کنارہ کشی کی جائے اور ظواہر یعنی فروعات و رسمی طرق و عادات کے مقابلہ میں اصول پر زیادہ زور دیکر مختلف مذاہب فقہ کو ایک مرکز پر لائیں اور اقتضائے زمانہ اور تمدنی ماحول کے لحاظ سے قانون کے ارتقائی اصول کا احیا کریں۔ اوامر و نواہی جو فرائض میں داخل ہیں ان میں اور مسائل و معاملاتِ دنیا جو اختیاری ہیں ان میں امتیاز رکھا جائے اور اس طرح مذہب اور قانون الگ الگ رہیں۔

پس میری رائے میں اگر مسلمان موجودہ جہل و ابتری سے نجات حاصل کر کے اپنی زندگی علم و آزادی سے سنوارنا چاہتے ہیں تو متذکرہ صدر اصلاحی پروگرام پر جو عین روحِ اسلامی پر مبنی اور اس کے بنیادی اصول ہی سے ماخوذ ہے انھیں عمل پیرا ہو جانا چاہیئے۔

ڈاکٹر صبحی کی تقریر کے ترجمہ کے بعد اب مملکتِ ترکیہ کے نمائندہ پروفیسر تیمور کی تقریر کا ترجمہ ملاحظہ کیجئے۔ یہ تقریر اس لئے زیادہ اہم ہے کہ ہمارے زمانے میں تجدید (بلکہ تجدد) کی ان کوششوں میں ترکی سب سے آگے آگے ہے۔

(۳)

مملکت ترکیہ میں شرعی قوانین کی جگہ حال ہی میں جو مغربی سانچوں میں ڈھلے ہوئے قوانین نافذ کئے گئے ہیں اس کے وجوہ و اسباب نیز مذہب و فقہ اسلام کے باہمی تعلق کے عنوان سے استنبول یونیورسٹی کے پروفیسر حفظی تیمور نے کانفرنس ثقافتِ اسلامی میں جو افتتاحی تقریر کی۔

محترم و فاضل رفقائے کار!

میرے پیشرو مقررین نے ان کوششوں کی جو فکر اسلامی میں عام طور پر اور قانون کے دائرہ میں خاص طور پر ہوتی رہی ہیں ایک واضح تصویر پیش کر دی ہے۔ ان سے آپ کو یہ محسوس ہو گیا ہو گا کہ بعد وفات حضور اکرمؐ گذشتہ تیرہ صدیوں کے دوران میں جو کروڑوں مسلمان بیشمار مذہبوں اور فرقوں میں تقسیم ہو گئے ہیں اس کا سب سے بڑا سبب شرعی قوانین کا اختلاف ہی ہے چنانچہ خود ہمارے چاروں مذاہب فقہ اختلافِ تعبیرِ احکام ہی کا نتیجہ ہیں۔ عجب نہیں کہ شرع اسلامی کی یہی بدیہی خصوصیت ہو جس نے اس مجلس کے بانیوں کو اس کانفرنس میں آج اسی مسئلہ پر بحث و تمحیص کی دعوت دینے پر مائل کیا ہو۔ مجھے بھی دس منٹ کا وقت دیا گیا ہے اور یہ خواہش کی گئی ہے کہ تمہیدی طور پر اس مضمون کے

خاص خاص پہلوؤں کی طرف اشارہ کروں۔ میری اس افتتاحی تقریر کے تین حصے ہوں گے۔ پہلا حصہ قوانین کی اس اصلاح سے متعلق ہوگا جو ترکیہ میں ۱۹۲۶ء کے بعد سے عمل میں لائی گئی۔ دوسرے حصہ میں ان اہم اور ناگزیر اسباب سے بحث ہوگی جن کی بدولت یہ عظیم و مہتم بالشان تبدیلی لازم ہوئی۔ پھر عالم اسلام کے تصوراتِ قانون اور احکام شرع، مذہب اور فقہ کا باہمی تعلق، نیز ان دونوں میں مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کیلئے وقتاً فوقتاً جو کوششیں ہوئی ہیں تیسرے حصہ کا موضوع ہوں گی۔

ترکی کی مشکلات صدیوں سے مختلف النوع اور متضاد احکام و قوانین اور قسم قسم کے فتووں اور عجیب عجیب تعبیروں کے ذخائر کی بدولت جنھیں شرع اسلامیہ کا نام دیا جاتا ہے سلطنت ترکیہ اپنے معاملاتِ عدالتی و قانونی میں بے انتہا دشواریوں اور پیچیدگیوں کا سامنا کرتی چلی آئی تھی۔ ایک تو خود مسلمان ہی کثیر التعداد مختلف و متضاد اور ناقابلِ توافق فرقہ ہائے مذہبی سے وابستہ تھے۔ دوسری طرف سلطان محمد فاتح نے جو استنبول فتح کیا تو اس کے بعد دوسرے ممالک بھی زیرنگیں آتے گئے اور مختلف مذاہب کی قومیں ترکی رعایا میں شامل ہوتی گئیں۔ اس طرح غیر مسلموں کا رعایائے ترکی میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ اس سے نظم و نسق عدالتی اور شرعی قانون کے متعلق گوناگوں دقتیں اور نت نئی دشواریاں لاحق ہوتی گئیں چنانچہ ہر زمانے میں ترکوں نے شدت سے یہ ضرورت محسوس کی کہ کوئی ایسا نظام قانونی دستیاب ہو جو مستقل بھی ہو، ہر ایک کیلئے لازمی پابندی اور قابل قبول بھی۔ رعایا کے تمام طبقات کی ضروریات پر حاوی ہو اور سارے مذاہب کے لوگوں سے یکساں متعلق کیا جا سکے۔ ۱۸۳۹ء کی اصلاحات میں شعبہ قانون کی اس بدیہی بے استقلالی کو جس سے نظم و نسق عدالت میں اتنی ابتری پھیلی ہوئی تھی، دور کرکے ایک ایسا نظام قوانین نافذ کرنے کی کوشش نمایاں نظر آتی ہے جو بلا امتیاز نسل و مذہب سارے شہریوں پر یکساں حاوی اور ساری رعایا سے یکساں طور پر متعلق ہو سکے۔ چنانچہ شرعی قانون کی جگہ ۱۸۴۱ء میں ایک سول قانونِ تعزیرات مدون اور نافذ کیا گیا۔ اس کے بعد بری و بحری تجارت کے قوانین اور ضابطہ ہائے عدالتی کی تدوین عمل میں آئی۔ لیکن اب بھی مسلمانوں کے ازدواج اور نظم خاندان سے متعلق ان مسائل کو جو ہر سوسائٹی کی شیرازہ بندی میں اہم عنصر ہوتے ہیں باضابطہ قانون کی شکل دینے کی جانب کوئی قدم نہ اٹھایا جا سکا۔

نیا دور ۱۹۲۳ء میں جب لوزان کانفرنس ختم ہوئی ترکی میں ایک نیا دستور اور نیا دورِ حکومت شروع ہوا۔ اس نے ایک کمیٹی اس غرض سے مقرر کی کہ پورے ملک اور ساری رعایا کیلئے تعلقات قانونی یعنی حقوق و فرائض اور ذمہ داریوں کا ایک عمومی، یکساں اور مستقل و مؤثر نظام قائم کیا جائے۔ اس کمیٹی کو یہ خاص ہدایت تھی کہ اپنی سفارشات میں موجودہ احکام و ضوابطِ کار شرع اسلامی ہی سے ماخوذ اور مدون ہونے چاہئیں کیونکہ (وہ سمجھتے تھے کہ) تمام ضروریات قومی اور قانون و ضابطہ کار کی تدوین کیلئے فقہ اسلامی میں سارا مواد موجود ہے۔ لیکن آغاز کار ہی میں جو بحثیں چھڑیں اور جو ناقابلِ توافق نظریے پیش ہوئے یہ صاف محسوس ہونے لگا کہ قدم قدم پر رکاوٹ ہے اور ایک قدم بھی آگے بڑھنا دشوار ہے۔ ہر مسئلے اور ہر سوال کا ایک جداگانہ حل پیش ہوا۔ مختلف اور متضاد رائیں سامنے آئیں۔ احکام شرعی کی ماہیت و تعبیر اور حدیثوں اور آیتوں کے معانی میں توافق و ہم آہنگی ناممکن معلوم ہوئی۔ اسناد پر بحثیں ہوئیں اور نزاعات کا سلسلہ بڑھتا گیا۔ قسم قسم کے فتوے اور عجیب عجیب رائیں پیش ہوئیں اور حدیثوں کے اسناد اور صحت و معقولیت کے اعتبار سے کسی امر پر اتفاق کرنا محال نظر آیا۔ کمیٹی ایک برس تک ردوقدح

کرکے بالآخر تھک کر عاجز ہوگئی اور کام بند کر دینا پڑا۔ پس بعد غور کامل حکومت اس نتیجہ پر پہنچی کہ شرعی بنیادوں پر عمومی قانون بنانا ناممکن ہے اور سوائے اس کے کچھ چارۂ کار نہیں کہ ترکیہ کے قومی قوانین ممالک مغربی کے جدید نظام قوانین ہی پر ڈھالے جائیں۔ اب کی بار جو کمیٹی مقرر ہوئی اس نے قانون اور ضابطہ کے بالکلیہ نئے مسودے پیش کئے۔ سوئستان کا سول کوڈ، اطالیہ کا قانونِ تعزیرات، جرمنی و اٹلی کے بری و بحری تجارت کے قوانین اور نیوچائل کے نوٹہ کے قوانین ضابطہ بدون ہوئے۔ یہ تمام قوانین مجلسِ ملی کبیر کو پسند آئے اور منظور ہوگئے۔ رفتہ رفتہ دوسرے قوانین کا بھی اسی طرح نفاذ ہوتا گیا۔

یہ وسیع پیمانے کی قانون سازی جو اتاترک کی رہنمائی میں انجام پائی کوئی دفع الوقتی نہ تھی اور نہ یورپ کے نظامِ قوانین کی نامعقول اور اندھا دھند تقلید۔ دراصل یہ ایک حل تھا صدیوں کے مناقشات و اختلافات کا جو شرعی قوانین کے نفاذ میں پیدا ہو رہے تھے۔ بایں ہمہ یہ ہمہ گیر تبدیلی ایک مذہب کے قانون کو ترک کرکے دوسرے مذہبی قانون کو اختیار کرنے کے مترادف بھی نہ تھی کیونکہ مغرب کا نظامِ قوانین بالکلیہ غیر مذہبی بنیادوں پر قائم ہے اور مذہبی عقائد و رسومات سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ یہ صحیح ہے کہ یہ عظیم تبدیلی ایک انقلاب تھا جو دفعتہً رونما ہوا۔ وقت وہ تھا کہ ترکوں کے قدم ابھی پوری طرح میدانِ سیاست میں جمے نہ تھے۔ اس رواروی اور عجلت میں کچھ افراط و تفریط بھی ہوگئی جو بے اطمینانی اور انتشار کے زمانہ کی ہر تحریک میں ہوا ہی کرتی ہے چنانچہ بعد میں وقتاً فوقتاً ترمیمیں ہوتی رہیں اور اب یہ واضح ہوتا جا رہا ہے کہ کہاں کہاں ہنوز اصلاح کی گنجائش باقی ہے۔

دیگر اسباب شرع کو چھوڑ کر اس وسیع پیمانہ پر اصلاحِ قوانین عمل میں لانے کے کئی وجوہ و اسباب تھے۔ حکومت ترکیہ کا پہلے تصور یہ تھا کہ اسے حق حکومت اپنی مذہبی خیال کی رعایا سے حاصل ہوا ہے اسلئے اس نے بارہا یہ کوشش کی کہ نیا قانون شریعت کی پیروی اور مطابقت ہی میں وضع کیا جائے۔ لیکن یا تو کوشش سرے سے ناکام رہی یا قوانین جو مدون اور نافذ ہوئے ناقص اور غیر مکتفی ثابت ہوئے۔ ان کوششوں کی ناکامی کے کئی اسباب تھے۔ بالخصوص یہ تصور ہی غلط ثابت ہوا کہ اسلامی معاشرہ میں رعایا کے باہمی تعلقاتِ قانونی کو خواہ مخواہ احکام شرع ہی کے مطابق ہونا چاہئے۔ اور یہ بھی واضح ہوگیا کہ جدید گوناگوں تمدنی ضروریات اور زمانہ حال کی ترقی پذیر سوسائٹی کیلئے یہ کس قدر ناقابل عمل ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں اور نہ اس حقیقت سے اور نہ اس حقیقت سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ قرآن شریف ہر زمانے کیلئے ایک نہایت بلند پایہ اور عظیم کتاب ہدایت ہے۔ لیکن ہمیں اس سوال پر آزادانہ غور کرنا چاہئے کہ تعلقاتِ قانونی کی تنظیم کیلئے شرع اسلام میں مزید تین ماخذ کیوں ڈھونڈے گئے اور کیوں انھیں منظم کرکے اتنی ترقی دی گئی؟ اگرچہ بعض مسائل و احکام جو قرآن شریف کے علاوہ ان تین نئے سرچشموں سے ماخوذ ہیں بداہتاً فطری عدل و

حدیث انصاف ہی کے عام اصول اور فلاح عامہ ہی کی اساس پر قائم ہیں لیکن زیادہ تر احکام ایسے ہیں جو اس زمانہ کے عربوں کے رسم و رواج اور تمدنی حالات و قومی خصائل کے مقتضیات پر مبنی ہیں۔ یہ مسلمہ ہے کہ حضرت ختمی مرتبتؐ کی ذات گرامی کی حیثیت و شخصیت صرف روحانی دائرہ تک محدود نہ تھی بلکہ عرب کی مدنی ساخت اور قومی عادات و خصائل، روزمرہ کے کاروبار طور و طریق اور افراد کے باہمی تعلقات اور معاشرہ کی تنظیم خود حضور اکرمؐ کی بے بہا اور گرانمایہ ہدایت و رہنمائی کی محتاج اور طلبگار بھی تھی۔ اسلئے لازماً قانونی اصول اور ان کی حیات کے آئینی پہلو بھی اس سے مستفید و مستنیر ہوئے۔ اگر ہم ان مناقشات و اختلافات سے جو اقوال و اعمال و سنن نبویؐ اور ان کی اسناد کے بارے میں پائے جاتے ہیں صرف نظر بھی کرلیں

تو بھی یہ حقیقت باقی رہ جاتی ہے کہ اقوالِ پیغمبر جن میں عقل و خرد کے ایسے بیش بہا جواہر موجود ہیں جو ہر زمانہ میں دانشمندی و معقولیت کے آئینہ دار رہیں گے۔ ان میں ایسی احادیث بھی نظر آتی ہیں جو خاص حالات اور خاص خاص معاملات سے متعلق تھیں اور ہر زمانہ کی ضروریات تمدنی کا اقتضا پورا نہیں کر سکتیں اور نہ عمومیت کے ساتھ ہر ملک و ہر زمانہ سے متعلق کی جا سکتی ہیں۔ یہ دعویٰ بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ساری حدیثیں ایسی ہمہ گیر عمومی اور وسیع ہیں کہ ہر زمانہ میں ہر قسم کی قانونی احتیاج کا حل پیش کر سکیں۔ خود میرا عقیدہ یہ ہے اور یقین ہے کہ اس پر کسی کو اعتراض نہ ہوگا کہ اگر نبی اکرمؐ عرب کی بجائے کسی اور جگہ یا کسی اور زمانہ میں مبعوث ہوتے تب بھی دین اسلام کی عظمت و وقار پر کوئی اثر نہ پڑتا لیکن یہ زیادہ اغلب ہے کہ اس صورت میں ہرگز ایسا وسیع نظام قانون معرض وجود میں نہ آتا جیسا کہ ہمارا شرعی قانون ہے یا اس نہج کا جو ہمیں اپنے اسلاف سے ملا ہے۔ چنانچہ مذہب عیسوی میں جو اتنے محدود تصورات قانونی پائے جاتے ہیں اسکی بڑی وجہ یہی ہے کہ جس خطۂ ملک میں اسکی اشاعت اور ترقی ہوئی وہاں اس زمانہ میں پہلے سے ایک ہمہ گیر اور مؤثر و مستقل نظام قانون موجود اور رائج تھا جسے رومن لا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

فقہ اور اجماع یہ امر واقعہ ہے کہ قرآن اور چند ایک حدیث کو چھوڑ کر اسلامی شرع کے جو اور دوسرے حصے ہیں وہ زمانہ مابعد کی تمدنی ضروریات پوری کرنے کیلئے وضع کئے گئے ہیں علوم عمرانی کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ معاشرہ ہمیشہ ایک حال پر برقرار نہیں رہتا۔ سوسائٹی زمانہ کے ساتھ تغیر پذیر ہوتی ہے اور اسی ایک سلسلۂ تغیر و انقلاب سے گذرتے رہنا پڑتا ہے۔ ہر تغیر کے ساتھ قدریں بدلتی ہیں اور ان کے معیار اور اندازے بھی تبدیل ہو جاتے ہیں اور ہر ترقی پذیر سوسائٹی کیلئے انقلاب ناگزیر ہے پس اس اصول کا تسلیم کر لینا جو حقیقتِ نفس الامری پر مبنی ہے اسلام کی اسپرٹ کے مغائر اور اسکے اصول کے منافی نہیں۔

ہمارے ملک میں شریعت کے ماخذوں کے مطابق اور ان کے اتباع میں آئین بندی قانون سازی میں جو موانعات درپیش آئے ان میں ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ زمانہ حال کی سوسائٹی کے مختلف النوع اور پیچیدہ ضروریات کیلئے شریعت میں مناسب اور موزوں حل نہ مل سکے۔ اسی طرح تغیرات کے وسیع میدان میں اور اختیار سماعت کے مسئلہ پر قوانین و قواعد اس قدر کم ہیں کہ ان کا عدم اور وجود برابر ہے اور تجارتی معاملات اور بین الاقوامی تعلقات کے گوناگوں مسائل میں قانونِ شرع سے کوئی رہبری نہیں ملتی پس کوئی مذہب اگر اپنے پیروؤں کی ساری ضروریات پوری کرنے کا دعویٰ کرے تو اسے کیا کچھ دقتیں اور دشواریاں لاحق نہ ہوں گی مثلاً ہر مذہب کا خواہ وہ کوئی سا کیوں نہ ہو یہ خاص الخاص اصول ہے کہ نیکی اور نیکوکاری کا ثمرہ اور ثواب آئندہ یعنی آخرت میں ملے گا اور بدی و معصیت کاری کی سزا بھی عقبیٰ میں ملیگی۔ اگر بات یہی ہے تو یہ سوال قدرتاً پیدا ہوتا ہے کہ ایسے افراد کا کیا حشر ہوگا جو اپنے جرائم کی دنیا ہی میں سزا بھگت چکے یا جو سزا سے بچنے میں کامیاب ہو گئے یا جن کی سزائیں معاف کر دی گئیں؟ کیا وہ آخرت میں پھر مستوجب سزا ہوں گے؟

ایک ووٹ دو شواری زمانۂ جدید کے تصوراتِ سیاست و حکمرانی اس کے مقتضی ہیں کہ ہر مملکت بلا لحاظ مذہب و مشرب اور بلا امتیاز رنگ و نسل ہر شہری کے ساتھ یکساں اور مساوی برتاؤ کرے اور بلا کسی فرق و استثناء کے سب کیلئے یکساں قوانین متعلق کرے، اور یہ امر اس صدی کے مسلمہ اور معقول اصولِ جمہوریت و انسانیت کے مغائر ہوگا کہ ایک ہی ملک کی رعایا کے علیحدہ علیحدہ طبقات یا مذہبی گروہوں اور فرقوں کیلئے علیحدہ علیحدہ قوانین بنائے اور جدا جدا عدالتیں قائم کرے۔ اس سے تو ایک ہی قسم کے حالات و معاملات میں مختلف اور متضاد فیصلے ہو جایا کریں گے۔ حالانکہ اس سے کسی کو انکار نہیں اور نہ ہو سکتا ہے کہ تمام مذاہب میں بنیادی اصول عدل و مساوات کے یکساں اور ایک ہی ہیں۔

علاوہ ازیں بہت سے احکام قانونی اور قواعد اسلامی شرع میں ایسے بھی ہیں جن پر نہ کوئی عمل کرتا ہے اور نہ جن کی پیروی ہو سکتی ہے اور مملکت ترکیہ ہی میں نہیں بلکہ دوسرے مسلم ممالک میں بھی یہ متروک اور ناقابل عمل ہو گئے ہیں۔ کیونکہ وہ معاشرہ کے ایک مخصوص درجہ تمدن کیلئے وضع ہوئے تھے اور جوں جوں زمانہ

بڑھتا گیا ترقی پذیر اقوام کی ضروریات کیلئے غیر کفی ثابت ہوتے گئے اور بالآخر بے اثر ہو کر رہ گئے۔ مثلاً مجلۂ (مجموعہ قوانین سابق) ہی کو دیکھ لیجئے۔ اس میں ہزاروں دفعات اس بنا پر شامل کر دی گئی تھیں کہ وہ شرع اسلامی کا اہم اور ضروری حصہ ہیں مگر نہ تو کبھی ان کی ضرورت پڑی اور نہ ان پر عمل کرنے کی نوبت آئی۔ تعدد ازدواج اور اس کے متعلقہ احکام کا مسئلہ بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔ یہ ترکی میں چنداں مروج نہیں اور مشرقی کے بیان کے مطابق ہندوستان کی بھی ننانوے فی صدی مسلمان آبادی وحدت ازدواج ہی پر عمل پیرا ہے۔ بس اب ایسے مسائل کے قانون بنانا اور جواز کی صورتوں کا مرتب کرنا جبکہ اس پر عادتاً اور عام طور پر عمل ہی نہ ہوتا ہو، عبث اور غیر ضروری ہی متصور ہوگا۔ شرع نے بھی تعدد ازدواج کو جائز تو رکھا ہے مگر ایسی کڑی اور سخت شرطیں لگا دی ہیں جو شاذ و نادر ہی پوری ہوتی ہیں۔ اس سے غیر محدود تعدد ازدواج کی جو قبل اسلام عرب میں جاری تھا اصلاح ہو گئی اور عملاً وحدت ازدواج کی پیامبر ثابت ہوئی لیکن اس بارے میں مسائل کے جو دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں وہ عملاً اور فی زمانہ بیکار ہی ہیں۔

یہ بھی واضح رہے کہ ترکی نے یہ فیصلہ کرنے سے پہلے کہ یورپی مفہوم کا کوئی یکساں عمومی اور ہمہ گیر قانون مدون و نافذ کیا جائے اسلامی شریعت سے ماخوذ ہو سکنے والے تمام قوانین اور ان کے افادہ اور امکانات کی بھی پوری جانچ اور تحقیق کر لی تھی۔ جو اسباب ہمارے ملک میں اس اصلاح کے محرک اور جو اصول اس انقلاب کی تہ میں کارفرما تھے وہ ہرآئینہ ایسے نہ تھے جن سے بحیثیت ایک دین عظیم کے اسلام سے کوئی بیزاری یا بے اعتنائی پیدا ہوتی۔ البتہ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ان اصلاحات میں کسقدر کامیابی ہوئی ہے اور وہ سارے فائدے جو اس سے مقصود تھے حاصل ہو گئے یا نہیں یہ تو مرور زمانہ ہی سے معلوم ہو سکے گا۔

اصلاح کی شکل

اب میں اپنی تقریر کے آخری حصہ پر آتا ہوں۔ ہمارے ملک میں اگرچہ اصلاح قوانین سے لاحق دشواریوں کا بظاہر ایک حل نکل آتا ہے لیکن ہم مسلمانوں کے سامنے ابھی ایک اہم سوال باقی ہے اور وہ ہے اسلامی شریعت کے مختلف مسائل و احکام میں توافق پیدا کرنا۔ عظمت مآب ڈاکٹر صبحی نے اسکے حل کیلئے کچھ تجویزیں پیش کی ہیں۔ بہ لحاظ نوعیت یہ ہیں تو دلچسپ مگر مجھے کچھ حقائق سے دور اور ناقابل عمل ہی دکھائی دیتی ہیں مثلاً ان کی یہ تجویز کہ چاروں مکاتب فقہ کو ایک مرکز پر لایا جائے میں سمجھتا ہوں کہ اگر یہ دلی خواہ اتحاد ممکن الحصول ہو بھی جائے تب بھی اس سے ہماری دشواریاں حل نہ ہونگی۔ وجہ یہ کہ ان چاروں مذاہب میں سے ہر ایک اپنی روایات اور اپنے امام کی رائے پر مبنی ہے اور روایات خود مختلف ادوار و مدارج تمدن اور اپنے اپنے زمانہ کے رواج پر مبنی ہیں اسلئے اگر چاروں مکاتب فقہ کو ایک ساتھ ملا بھی لیا جائے تب بھی ہمیں زمانہ حال کے مسائل کا حل نہ مل سکے گا اور ہماری شریعت میں بدستور فروگذاشتیں اور خامیاں باقی رہ جائیں گی۔

میں بھی اس سلسلہ میں چند امور آپ حضرات کے غور کیلئے پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔ مذہب میری رائے میں تعلق اور رشتہ ہی بندہ اور معبود کے درمیان۔ اور کام اس کا یہ ہے اور یہی ہونا چاہئے کہ وہ افراد کی اخلاقی و روحانی زندگی کو آراستہ اور پیراستہ کرے۔ اسلام میں پیشوائیت کوئی چیز نہیں اور نہ ہی خالق و مخلوق کے درمیان کسی واسطہ یا وسیلہ کی حاجت ہے۔ دین اسلام ایک ہمہ گیر مذہب ہے اور ترک یا عرب کسی ایک قوم کا اجارہ نہیں۔ میں مسلمان کی حیثیت سے یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ مذہب ہی ساری زندگی کا محرک ہے اور اسکی روح رواں بھی۔ لیکن ساتھ ہی میرا یہ ایقان بھی ہے کہ ہمارے روزمرہ اعمال اور کاروبار بالکلیہ مذہب کے مقرر کئے ہوئے اوامر و نواہی کے تابع پہلے سے طے شدہ احکام کے پابند نہ ہونے چاہئیں۔ کیونکہ خالق اکبر نے اس دنیا میں ہماری رہنمائی اور رہبری کیلئے ہمیں عقل و شعور سے سرفراز کیا ہے۔ فکر و عمل کی پوری آزادی دیدی ہے اور آخرت میں وہی اس کا محاسبہ فرمائیگا کہ کس حد تک اس آزادی کا صحیح استعمال کیا گیا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایک ایسی سوسائٹی جس نے اس رشتہ عبد و معبود کی حقیقت سمجھ لی ہے اپنی صلاح و فلاح کیلئے بالکلیہ شرعی قوانین کی محتاج ہے۔ عابد معبود کے درمیان تعلق کا احساس ہی سچا مذہب ہے اور اسکا دارومدار بالکلیہ شریعت پر نہیں۔

کیا اس سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے کہ بربر اور دوسری اقوام مسلم جو صدیوں سے شریعت مروجہ سے بالکلیہ مختلف نظام قانون پر عمل پیرا ہیں مسلمان ہیں اور بہت اچھے مسلمان؟ یہ کہنا درست ہوگا کہ مصر، شام، عراق و ایران جو اپنے آئین و قوانین کی تدوین و نفاذ میں یورپ کے خصوصی تصورات قانونی کو مانتے اور یہ جان کر عمل کرتے ہیں کہ ان کی حیات مستقلہ کیلئے ان کی ضرورت ہے گھٹیا قسم کے مسلمان ہیں یا اسلام کی خلاف ورزی اور اس کے اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں؟ اس کے برعکس اس حقیقت سے ایک طرح میرے اس ایقان ہی کی تائید ہوتی ہے کیونکہ ان آئین و قوانین میں بہت سی ایسی باتیں بھی ہیں جو ٹھیٹ روایاتی شرع کے مطابق نہیں جس کا

تقاضا یہ ہوتا ہے کہ رعایا بہرحال بلا چون و چرا حکم کی اطاعت کرتی رہے۔ ان ممالک ہی کی طرح ترکی نے بھی اسلام کے ساتھ اپنی وفاداری قائم و برقرار رکھی ہے اور اس میں اب بھی وہی اسلامی جوش و سرگرمی باقی ہے اور باوجودیکہ ترکی میں شرعی قانون کو خیرباد کہے ہوئے ستائیس سال گذر چکے ہیں ترکوں کے خلوص و وفاداری اسلام میں کوئی فرق نہیں آنے پایا۔

تنگ نظری

بعض ایسے ضوابط و قوانین کا جو تیرہ سو سال پیشتر کی سوسائٹی کے تعلقات کاروبار کو منضبط کرنے کیلئے وضع ہوئے تھے یا بعد وفات رسول اکرم مشتبہ اور مبہم مختلف فیہا ذریعوں سے مرتب کئے گئے آج کی سوسائٹی کے سر تھوپ دینا اور پھر اس پر اصرار کرنا کہ انھیں خواہ مخواہ زمانہ حال کی ضروریات اور متنوع کاروبار و تعلقات کی تنظیم اور اس سے متعلقہ ساری پیچیدگیوں کا حل مان لو، ایک ایسی ذہنیت کا پتہ دیتا ہے جس نے موجودہ زمانہ کی حقیقتوں کا نہایت تنگ اور ناقص اندازہ کیا ہے اور حقائق موجودہ کی بصیرت نہیں رکھتی۔ پس امر غور طلب ہے کہ بجائے اس کے کہ اپنی مشکلات کے معقول و حقیقت پسندانہ اور فطرتی عدل و انصاف سے ماخوذ کئے ہوئے حل ڈھونڈے جائیں مبہم مشتبہ مختلف فیہا و پیش از پیش قائم کئے ہوئے غیر محدود تصوراتِ مذہبی سے ہماری وابستگی کس حد تک معقول متصور ہوگی۔ کیونکہ آخر مذہب کی اساس اور روح رواں فطرتی عدل و انصاف ہی تو ہے میں تو یہ کہنے میں بھی تامل نہ کرونگا کہ آئے دن کے نزاعات روزمرہ کے معمولی مسائل اور چھوٹی موٹی باتوں کے تصفیہ کیلئے اٹھتے بیٹھتے مذہب کے معرض بحث میں لانا مذہب کی توہین ہے۔ اسکی غایت اور نصب العین اس سے بہت اعلیٰ و ارفع ہونا چاہیے۔ مثلاً جب قرآن شریف میں کوئی صاف اور واضح حکم نہ ہو کوئی مستند حدیث بھی کسی معاملہ سے متعلق نہ مل جائے تو دوسروں کی رائے اور قیاس سے اخذ کئے ہوئے احکام کو مذہب کے نام پر ہی کے سر تھوپ دینا کہاں تک درست ہو سکتا ہے۔ اس سے تو قوم میں مذہب کی طرف سے بددلی پیدا ہوگی اور اس کا احترام متزلزل ہو جائیگا کیونکہ مقدمہ کے ہر دو فریق کوئی نہ کوئی دعا رکھتے ہیں اور اپنے دعوے کی صداقت کا یقین بھی۔ ہو سکتا ہے کہ بعض اوقات ایک واقعی حق بجانب فریق مقدمہ ہار بیٹھے یا کوئی معصوم اور بیگناہ شخص مستوجب سزا قرار پا جائے۔ ایسے ناراض اور بددل اشخاص کا مذہبی قانون کے بارے میں ردعمل کیا ہوگا جنھیں مذہب یا مذہبی قانون کے نام پر انصاف سے محروم ہو جانا پڑا اور بلا وجہ سزا بھگتنی پڑی؟ کیا عجب ہے جو وہ مذہب ہی سے متنفر اور اس کے منکر ہو جائیں۔ پس غور کرنے کی ضرورت ہے کہ آیا معاشرت اور روزمرہ کے کاروبار میں دنیوی قانون پر عمل واقعی معصیت میں داخل ہے اور مسلمانوں کے معاملات کے تصفیے بالالتزام مذہب ہی کے نام سے ہوا کریں؟

آخر میں یہ صاف کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے جو کچھ کہا ہے اور جو خیالات ظاہر کئے ہیں ان سے کسی کی دل آزاری یا کسی فرد یا جماعت پر حملہ کرنا مقصود نہ تھا اگر اس سے کسی کی دل شکنی ہوئی ہے یا کسی کے جذبات کو ٹھیس لگی ہے تو میں بصد عجز معذرت خواہ ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میرے بعض تصورات ضرورت سے زیادہ آگے نکل گئے ہوں اور ممکن ہے ذاتی بڑائی اور تفاخر پر محمول کئے جائیں تو میں یہ عرض کرونگا کہ میرے خیالات اس اہم موضوع کے متعلق ایک پرخلوص عقیدہ پر مبنی ہیں اور میری نظر میں یہ ایقان محض نظری نہیں بلکہ صاف و صریح حقائق پر مبنی ہے —— پس میری استدعا ہے کہ از راہ کرم آپ حضرات اپنی تنقید اور مشورہ سے مجھے ممنون فرمائیں۔ اور میں یقین دلاتا ہوں کہ میں ہر حال اپنی غلطی اور غلط فہمی کی اصلاح کیلئے آمادہ و تیار رہوں۔ فقط

اس کے بعد پروفیسر مجید صاحب کی تقریر کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے:-

(۴)

شریعتِ اسلامیہ اور دنیوی اصول پر قانون سازی

از پروفیسر مجید خدوری — جان ہاپکنس یونیورسٹی امریکہ

مغربی اثرات کا نفوذ جدید مشرق وسطیٰ کی حالیہ تمدنی و عمرانی تبدیلیوں کی ایک خاص خصوصیت ہے چنانچہ وہاں شریعت اسلامی کے دوش بدوش مغربی سول قوانین نافذ ہو چکے ہیں۔ اصل دشوار مسئلہ کا حل ڈھونڈا جا رہا ہے کہ ان کا باہمی تصادم کیونکر دور ہو اور کس طرح ان دونوں میں توافق و ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ مصر، شام اور عراق میں ڈاکٹر صنہوری نے جو قانون دیوانی مرتب کیا ہے اور اس میں جو پہلو اختیار کئے ہیں اس سے شریعت اسلامیہ کی تجدید اور اسے دنیوی اصولوں پر قائم کرنے کی تحریک کو بڑی تقویت حاصل ہو گئی ہے۔ انھوں نے قانون کے میدان میں جو کام کیا ہے وہ فی الحقیقت شیخ محمد عبدہ کی تحریک تجدید ہی کا سلسلہ ہے جس کی اصل غایت یہ تھی کہ شریعت اسلامی کے بہترین اجزا اور نئے قانونی تصورات کو یکجا جمع کیا جائے۔ ان کا تصور یہ تھا کہ اسلام اور مغربی تمدن میں درحقیقت کوئی تصادم ہے ہی نہیں لیکن صنہوری نے جو پہلو اختیار کیا ہے وہ شیخ عبدہ کے

کچھ آگے بڑھ گیا ہے۔ اور ان کی کوشش یہ معلوم ہوتی ہے کہ اصولِ شریعت اسلامی اور مغرب کے اصولِ قانون کا ایک ایسا مرکب تیار کیا جائے جو زمانۂ حال کے عربوں کی زندگی سے کامیابی کے ساتھ متعلق کیا جا سکے۔ اگرچہ شریعت کو نئے اصول پر مرتب کرنے کے بارے میں ڈاکٹر صنہوری کچھ نہیں کہتے مگر ان کی بحث کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ اسی طریق کو قبول کرتے ہیں جسے ابتدائی اصول پر قانون سازی کہنا چاہئے۔ قانون کے دائرہ میں ان کا طریق کار انتخاب، انطباق اور اسلامی شریعت سے مغربی قوانین کے امتزاج ہی کی چارگونہ کوششوں پر مشتمل معلوم ہوتا ہے اور ان کی تفصیل اس طرح بیان کی جا سکتی ہے۔

(۱) مغرب کے ان ضروری اصول قانونی کو اختیار کر لینا جو شریعتِ اسلامی میں موجود نہیں ہیں یعنی ایسے مسائل و احکام قانون مغرب سے مدوّن کر لینا جن کی شریعت میں کوئی رہنمائی نہیں ملتی۔

(۲) ایسے قوانین کو جو زمانۂ حال کی ضروریات کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں اور ممالکِ مغرب میں بھی جدید قانون سازی کے محرک ہوئے ہیں جو اصولاً شرع اسلامی کے مغائر نہیں اور نہ اسی شرح و بسط کے ساتھ شرع میں بیان ہوئے انہیں اختیار کر لیا جائے تو زندگی کے ان پہلوؤں پر بھی روشنی پڑیگی جو نورِ شریعت سے مستنیر نہ ہو سکے۔

(۳) ان شرعی احکام کی جگہ جو کہ زمانہ بے اثر اور غیر ضروری ہو گئے ہیں چند ضروری مغربی قوانین کو لے لینا۔

(۴) شریعت کے ان احکام کو جو اعتقادات اور عبادت سے تعلق رکھتے ہیں تعزیری اور سول قوانین سے علیحدہ کر کے مدون و مرتب کرنا۔ ڈاکٹر صنہوری اپنے ترتیب دئے ہوئے جدید قانون میں اس بات کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے۔

طلوع اسلام

جیسا کہ ہم نے تمہیدی ریمارکس میں لکھا تھا ہم نے ان تراجم کو بلا تبصرہ شائع کر دیا ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ان تقریروں کے پڑھنے سے قارئین کے دل پر جو اثر پیدا ہوا ہے اور ان سے سینے میں جو خیالات اٹھے ہیں ان کے متعلق مختصر الفاظ میں کچھ لکھنا نہایت ضروری ہے کیونکہ انہیں اس طرح معلق چھوڑ دینے میں خطرہ کا امکان ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ان ممالک میں ان جامد قوانینِ شریعت کے خلاف بغاوت کے آثار نمودار ہو رہے ہیں جو زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دینے سے قاصر ہیں۔ ترکی نے تیس برس پہلے اس بغاوت کا عملاً اعلان کر دیا۔ یہ کہنا یکسر غلط ہے کہ ترکوں کے دل میں اسلام کی محبت نہیں۔ پروفیسر تمور اپنا سینہ کھول کھول کر اپنے مخاطبین کو دکھا رہے ہیں تاکہ وہ اس امر کی شہادت پیش کر سکیں کہ ترکوں کے دل اسلام کی محبت اور عظمت سے خالی نہیں۔ لیکن اسکے باوجود انھوں نے شرعی قوانین کو ایک طرف رکھ کر اپنے لئے ان قوانین کو اختیار کر لیا جنہیں (SECULAR) کہا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ انھوں نے اسلام کی محبت کے دعوی کے باوجود ایسا کیوں کیا؟ اس سوال کا جواب ہر اس شخص کے سامنے ہے جس نے عثمانی خلافت کے آخری دور کی ترکی کے حالات کا مطالعہ کیا ہے اور اس کے بعد ترکی کے انقلاب کی تاریخ پر نگاہ ڈالی ہے۔ انقلاب سے پہلے کی ترکی ذلت اور پستی کے اس انتہائی درجہ تک پہنچ چکی تھی جسے جہنم کا درکِ اسفل کہا جاتا ہے۔ اس کی بیشتر وجہ وہاں کی ملوکیت اور ملا کی خود ساختہ شریعت ہے۔ چنانچہ مصطفیٰ کمال اور اس کے رفقاء کی انقلابی جماعت نے ملوکیت کی لعنت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد مملکت کیلئے کسی حیات بخش ضابطۂ قانون کی تدوین کے مسئلہ کو سامنے رکھا۔ ان کے دل میں اسلام کا احترام تھا، چنانچہ انھوں نے وہاں کے ماہرینِ شریعت علماء سے کہا کہ وہ ایک ایسا ضابطۂ قوانین مرتب کریں جو زمانۂ حال کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔ یہ علماء چھ مہینے تک ایک دوسرے سے لڑتے رہے اور اس ضابطۂ قانون کے مبادیات کے متعلق بھی کسی متفق علیہ فیصلہ تک نہ پہنچ سکے۔ جدید ترکی کیلئے ایک ایک لمحہ نہایت قیمتی تھا۔ وہ علماء کے اس جنگ و جدال کو کب تک ضبط کی نگاہ سے دیکھتے رہتے۔ بالآخر وہ تنگ آ گئے اور انھوں نے ان سے کہدیا کہ ہم تمہارے متفق علیہ شرعی ضابطہ کے انتظار میں مملکت کو تباہ تو نہیں کر سکتے۔ اگر تم ہمیں شرعی ضابطہ نہیں دے سکتے تو ہم اپنی عقل و بصیرت کی بنا پر جس چیز کو مملکت کیلئے بہتر سمجھتے ہیں اسے اختیار کئے لیتے ہیں۔ یہ تھے وہ حالات جن میں ترکی نے اپنے لئے سیکولر قوانین کو اختیار کیا۔

جن مشکلات کا سامنا ترکی کو کرنا پڑا تھا بعینہ وہی مشکلات اب دوسرے اسلامی ممالک کو بھی درپیش ہیں۔ یہ مشکلات تو پہلے ہی سے موجود تھیں، یوں کہئے کہ ان کا احساس اب ابھر کر سامنے آ رہا ہے۔ چنانچہ وہ بغاوت جس کے آثار آپ کو ان تقاریر میں نظر آ رہے ہیں اسی احساس کا نتیجہ ہیں۔ یہ ممالک دیکھ رہے ہیں کہ جن قوانین کو شرعی قوانین کے نام سے پیش کر کے ابدی اور غیر متبدل قرار دیا جا رہا ہے ان میں اس کی صلاحیت ہی نہیں کہ وہ ہمارے زمانہ کے تقاضوں کا ساتھ دے سکیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان میں کچھ ترمیم و تنسیخ کر دی جائے لیکن اربابِ شریعت کا حکم ہوتا ہے کہ تم انہیں چھو بھی نہیں سکتے۔ اس کے بعد

وہ اپنے لئے اس کے سوا کوئی راہ نہیں پاتے کہ سرے سے شریعت ہی کو خیرباد کہہ دیا جائے۔

یہ حالات جو باقی ممالک میں بتدریج نمودار ہوئے ہیں پاکستان کے سامنے یک لخت آکھڑے ہوئے ہیں اسلئے کہ اس نے پہلی بار آئین سازی کے سوال کو اپنے سامنے رکھا ہے اور یہ اعلان کیا ہے کہ یہ آئین شریعت کے مطابق ہوگا۔ اس بات کا اعلان کرتے وقت انھیں اس کا بالکل علم نہیں تھا کہ شریعت کسے کہتے ہیں اور اس کے مروجہ قوانین کس قسم کے ہیں۔ اس اعلان کے بعد جب انھوں نے ان قوانین پر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ ان کے مطابق وہ زندگی کے راستہ پر ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔ چونکہ وہ پہلے اعلان کر چکے تھے کہ ہمارا آئین شریعت کے مطابق ہوگا اسلئے اب اس میں سے گریز کی راہیں نکالنے لگے۔ یہ ہیں وہ پریشان کن حالات جن میں اس وقت پاکستان کے ارباب حل و عقد بری طرح پھنسے ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنا پہلا آئین کسی نہ کسی طرح بنا ڈالا ہے۔ یہ آئین ایسا ہے جس میں یہ نہ دیانت داری کو دیکھ رہے ہیں اور نہ دین کے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اگر انھوں نے دین کو سمجھنے کی کوشش نہ کی تو پانچ سات برس کے بعد یہ بھی علانیہ اس نام نہاد شریعت کے جوے کو الگ پھینک دیں گے۔

طلوع اسلام نے شروع سے یہ کوشش جاری رکھی ہے کہ ملک کے سنجیدہ طبقہ میں دینی شعور کو بیدار کیا جائے اور انھیں بتایا جائے کہ دین اور دینی نظام سے مراد کیا ہے۔ اس نے یہ بتایا ہے کہ

(۱) قرآن کریم نے ان غیر متبدل اصولوں کو متعین کر دیا ہے جن کی بنیادوں پر اسلامی معاشرہ کی عمارت استوار ہوگی۔

(۲) اس نے ان اصولوں کی جزئیات کو دانستہ غیر متعین چھوڑ دیا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جزئیات ہمیشہ زمانے کے تقاضوں کے ساتھ بدلا کرتی ہیں۔ اس کا حکم یہ ہے کہ ہر زمانہ کے مسلمان ان جزئیات کو اپنے اپنے حالات کے مطابق باہمی مشاورت سے خود متعین کریں۔

(۳) ان جزئیات کو پہلی مرتبہ نبی اکرم صلعم نے اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق صحابہ کے مشورہ سے مرتب فرمایا اور چونکہ اس کا یہ منشاء قطعاً نہیں تھا کہ یہ جزئیات آنے والے مسلمانوں کے لئے ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں اس لئے آپ نے ان کا کوئی مجموعہ مرتب کر کے امت کو نہیں دیا۔

(۴) اس کے بعد اسلامی سلطنت کے ابتدائی ادوار میں اپنے اپنے زمانہ کے تقاضہ کے مطابق قوانین مرتب ہوتے رہے اس کا نام فقہ ہے۔

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اسلامی قوانین میں غیر متبدل صرف وہ اصول ہیں جو قرآن کے اندر دیئے گئے ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ بھی ہے اس میں کوئی چیز غیر متبدل نہیں۔ یہ جو قانون کے چار مآخذ بتائے جاتے ہیں' یعنی قرآن، حدیث اور اجماع، اسے کوئی دینی سند حاصل نہیں۔ دینی سند صرف قرآن تک محدود ہے۔

اگر کوئی شخص مصطفیٰ کمال کو اتنی سی بات سمجھانے والا ہوتا تو یقین ہے کہ وہ مملکت ترکی کیلئے ایسا قانون مرتب کر لیتا جسے ہم صحیح اسلامی قانون کہہ سکتے۔ لیکن اگر وہاں ایسا نہیں ہو سکا تھا تو پاکستان میں تو ایسا ہو سکتا تھا اور ہو سکتا ہے۔ مشکل یہ ہوئی کہ یہاں کے ارباب حل و عقد میں کوئی شخص اتنی بڑی (PERSONALITY) نہیں رکھتا جو یہاں کے ملاؤں کے مزعومہ طوفان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اصلاح کے لئے قدم اٹھاتا۔

بہر حال ہم مملکت کے سنجیدہ اور ہمدرد طبقہ سے ایک بار پھر اپیل کرتے ہیں کہ وہ سوچیں کہ قرآن کس طرح ایک ایسا نظام پیدا کر دیتا ہے جو ایک طرف ان زنجیروں کو بھی توڑ دیتا ہے جسے انسانوں کی خود ساختہ شریعت نے وضع کر رکھا ہے اور دوسری طرف دین سے بھی ان کا گہرا تعلق قائم رکھتا ہے۔ اگر ہم پاکستان میں اس قرآنی نظام کو متشکل کر سکیں تو تیرہ سو سال کے بعد ہم ایک بار پھر اس معاشرہ کی تجدید کر سکیں گے جو محمد رسول اللہ والذین معہٗ کے مقدس ہاتھوں سے وجود پذیر ہوا تھا۔

عجمی مذاہب کا اثر مسلمانوں کے عقائد پر

(تاریخی نقطۂ نظر سے)

(محترم خواجہ عباد اللہ صاحب اختر بی۔ اے۔ جہلم)

تاریخی نقطۂ نظر سے اکثر محققین نے اس اثر پر مفصل بحث کی ہے جو مسلمانوں نے مختلف قرون میں غیر اسلامی مذاہب و ثقافت کا قبول کیا اور اسی اثر کے تحت ان میں تفرقہ اور فرقہ بندی پیدا ہوئی اور امت مسلمہ کی وحدت ملت کا شیرازہ بکھر گیا۔

آنحضرتؐ کی بعثت کے وقت چند مذاہب موجود تھے اور انکی نمایندگی ہمسایہ اقوام کر رہی تھیں، ان میں سے اہل کتاب کے مذاہب یہود و نصاریٰ کے ہیں اور یہ اسلام کے اقرب ہیں ان کا سرچشمہ ملت ابراہیمؑ ہے، یہود نے ملت ابراہیمؑ جہاں تک "توحید" کا تعلق ہے قائم رکھی اور غیر مذاہب کا اثر قبول نہیں کیا، توحید اصل اصول ملت ابراہیمؑ ہے لیکن یہودیت غیر تبلیغی مذہب ہے۔ یہ ہمیشہ اغیار سے بیگانہ رہے اور آج بھی نسلی امتیاز ان کی قومیت میں نمایاں ہے، اگر کسی نے ان کا مذہب قبول کیا تو اسکی حیثیت ان میں "شودر" کی تھی جیسی کہ آریا اقوام میں غیر آریا لوگوں کی ہے، ہر ایک یہودی اپنے آپ کو خدازاد یقین کرتا۔ ان کا آخری نبی حضرت مسیحؑ ایک کنعانی عورت کو کہتا ہے کہ "بیٹوں (بنی اسرائیل) کی روٹی کتوں (غیر بنی اسرائیل) کو نہیں دی جا سکتی"[1]۔ لیکن ایام جاہلیت و ظلمات (DARK AGES) کا یہ عام خاصہ تھا اور ہر ایک قوم اپنے آپ کو دیوتاؤں کی اولاد اور غیروں کو ملیچھ اور ایسے ہی قبیح ناموں سے موسوم کرتی۔ اور "عقیدہ علو" (SUPERIORITY COMPLEX) اتنا پختہ ہو چکا تھا کہ آج بھی کسی نہ کسی رنگ میں نمایاں ہے۔

تاریخی حقیقت یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی بعثت سے پیشتر کوئی بھی تبلیغی مذہب ایسا نہ تھا جیسا دین اسلام آنحضرتؐ نے پیش کیا۔ دو مذاہب "بودھ مت" اور "مسیحیت" خاص اسباب کے تحت ضرور تبلیغی صورت اختیار کر چکے تھے "بودھ مت" ہندوستان میں ایک ایسا ہی مذہب تھا جیسے اور بھی ہیں، اور اگر ان کے بھائی بند داداری سے کام لیتے تو یہ مذہب ہندوستان کی حدود اور آریا ہندو قوم سے باہر نہ جاتا، بودھوں کو مجبوراً ہمسایہ ممالک تبت اور چین میں پناہ لینی پڑی اور امم مغلیہ نے رفتہ رفتہ ان کا مذہب قبول کر لیا۔

فرانسیسی فاضل رینان (RENAN) اپنی تاریخ کلیسائے مسیحی میں لکھتا ہے کہ "مسیحیت" (CHRISTIANITY) پولوس کا معجزہ نام ہے اس سے پیشتر مسیحؑ کے متبعین اپنے آپ کو "حواری" اور "مومنین" کہتے اور ان کے ہم قوم اسرائیلی ان کو "ناصری" سے موسوم کرتے۔ مسیحؑ کی جائے پیدائش "ناصرہ" بھی زیادہ سے زیادہ یہ فرقہ ایسا ہی تھا جیسے اور فرقے بھی فریسی اور صدوقی وغیرہ تھے چونکہ "ختنہ" دین ابراہیم کا امتیازی نشان تھا اسلئے "نامختوں" اقوام میں تبلیغ شرعاً ممنوع تھی مسیحؑ اور حواریان مسیحؑ نے کبھی غیر اسرائیلی اقوام میں تبلیغ دین نہیں کی، رفع مسیح کے بعد پولوس نے یونانیوں اور رومیوں میں تبلیغ "مسیحیت" شروع کی۔ پولوس نہ کبھی مسیحؑ سے ملا اور نہ حواریوں کی صحبت کا فیض یافتہ تھا بلکہ ہمیشہ ان سے کنارہ کش رہا۔ یہ باور کرنے کے وجوہ ہیں کہ پولوس حکومت وقت رومی کورنمنٹ کی سیاسی بساط کا ایک مہرہ تھا۔ اپنے "مکتوبات" میں جو انجیل کا ضمیمہ ہے وہ اپنے آپ کو بھی قبیلہ

---

[1] موجودہ انجیل کی رو سے۔ (طلوع اسلام)

بنیمین کا ایک فرد اور کبھی پیدائشی رومی کہتا ہے اور یہ بھی فخریہ کہتا ہے کہ وہ اہل ایمان (یہود) میں ایماندار اور بے ایمانوں (رومی و یونانی) میں بے ایمان، مختونوں میں مختون اور نامختونوں میں نامختون، غرض ہر ایک سوانگ بھرتا رہا اور غرض یہ تھی کہ "مسیح کے نام پر ہر ایک قوم و ملت کے آدمی کھینچ لاؤں" (نامہ بنام قرنتیان - ۱ $\frac{9}{19}$)۔ پولوس نے شریعت توراۃ کو تقویم پارینہ (OLD TESTAMENT) قرار دیا اور نیا عہد نامہ (NEW TESTAMENT) پیش کیا اور دعویٰ کیا کہ "اس انجیل کے سوا جو میں پیش کر رہا ہوں اگر کوئی اور انجیل کسی اور شخص کی پیش کردہ قبول کریگا تو ملعون ہوگا" (نامہ قرنتیان $\frac{1}{2}$، نامہ گلیتان $\frac{1}{4}$) اس "عہد نامہ نو" میں پولوس نے زیادہ تر وہی باتیں پیش کیں جو آریہ اقوام رومیوں اور یونانیوں کے عقائد میں داخل تھیں۔ (۱) رسم ختنہ موقوف کی، (۲) نجات کا ذریعہ صرف ایمان ہے اعمال کی ضرورت نہیں، مسیح صلیب پر کل دنیا جہاں کے گناہوں کا کفارہ ہوگیا۔ (۳) عقیدۂ تثلیث جس میں مسیح کو الوہیت کا درجہ دیا گیا اور بطور جہاد پیش کیا گیا، یہ اور اسی قبیل کی تعلیم پولوس کے مکتوبات میں نمایاں ہے۔

حواری اس وقت زندہ تھے۔ پولوس اور ان میں بقول فاضل رینان بلحاظ عقائد تضاد تھا اسلئے پولوس ان کو "ریاکاروں کی جماعت کہتا ہے" اور حواری بالخصوص مقدس یوحنا (مکتوب دوم) کا ارشاد ہے کہ "ہم میں بہت گمراہ اور گمراہ کن اشخاص پیدا ہوگئے ہیں جو یسوع مسیح کی بشریت کا انکار کرتے ہیں یہ شخص ضال اور دجال ہے" (۲) فاضل رینان لکھتا ہے کہ اشارہ پولوس کی طرف ہے۔ پولوس کی انجیل میں ارشاد ہے کہ شریعت (توراۃ) جیسے گنہگار بننا سکھاتی ہے، اس کا حکم ہے کہ "زنا نہ کر" اگر یہ حکم نہ ہوتا تو مجھے اس کا احساس نہ ہوتا کہ زنا ممنوع ہے۔ مقدس یعقوب اپنے مکتوب میں لکھتا ہے کہ "اے نکمے آدمی میں اپنا ایمان اعمال سے دکھاتا ہوں تو اپنا ایمان بلا اعمال دکھا، اگر کوئی بھائی یا بہن بھوکی اور ننگی ہو اور اگر کوئی ہمدرد یہ کہے کہ خوش رہ پیٹ بھر کر کھا اور کپڑے پہن کر گرم رہ اور کھانے اور پہننے کو کچھ نہ دے تو کیا اس کا پیٹ بھر جائے گا اور عریانی رفع ہو جائے گی"۔ فاضل رینان کہتا ہے کہ یہ تعریض بھی پولوس پر ہے۔

کہتے ہیں کہ تاریخ واقعات کا اعادہ کرتی رہتی ہے۔ ہم یہ واقعات اسلئے تفصیل کے ساتھ لکھ رہے ہیں کہ تاریخ اسلام میں بھی اس کا اعادہ ہوا اسلئے ان اسباب کو اچھی طرح ذہن نشین کرنا چاہئے جو اہل کتاب میں فرقہ بندی اور شر انگیز تفرقہ کی بنیاد ہیں۔

آنحضرتؐ کی بعثت کے وقت مسیحیت جو کچھ بھی تھی پولوس کی مسخ کردہ صورت تھی اور پولائن کرسچینٹی (PAULINE CHRISTIANITY) سے موسوم ہے۔

رہبانیت ہم لکھ چکے ہیں کہ بودھ مت اپنے ہم عصر جین مت کی طرح ہندوستان ہی میں محدود رہتا اگر حالات سازگار ہوتے۔ دونوں مذاہب میں امتیازی نشان "رہبانیت" ہے جو "اہمسا پرمو دھرما" پر مبنی ہے، بودھ مبلغ نہ تھے لیکن ان کی راہبانہ زندگی کا خاموش اثر تمام اقوام عالم نے قبول کیا۔ چونکہ ہندوستان کے اکثر حصہ پر بودھ حکومت صدیوں تک چھائی ہوئی تھی، بالخصوص اشوک اور کنشکا وغیرہ کے عہد میں راج دھرم تھا۔ اگرچہ ان کا قلع قمع یہاں خاطر خواہ ہوا مگر "اہمسا پرمو دھرما" کا نقش عوام کے دل پر اتنا پختہ ہو چکا تھا کہ مٹ نہ سکا اور آج بھی "وشنومت" اور عام ہندوؤں کا یہی عقیدہ ہے۔ اس عقیدہ میں بے پناہ کشش بھی ہے نفس انسانی اکثریت پسند واقع ہوا ہے خواہ یہ اچھی ہو یا بری، حظ نفس کے ساتھ فطری جذبہ حصول کمال بھی اس میں کارفرما ہے۔ رہبانیت میں دونوں باتیں پائی جاتی ہیں۔ زندگی مسلسل جدوجہد کا نام ہے۔ تنازع للبقا کی گتھی رہبانیت نے اس طرح سلجھائی کہ ہندوؤں کے عقیدہ کے مطابق "آواگون" یا "تناسخ" کے چکر سے مخلصی جسے

وہ "نروان" سے موسوم کرتے ہیں "ترک دنیا" ہی اس کا چارہ کار ہے صرف "پرم آتما" پر دھیان لگا کر سمادھی جانا ذریعہ نجات ہے، جب مسیحی دنیا نے اس کا اثر خاموشی سے قبول کر لیا تو بودھ تارک دنیا کی طرح یہ بھی "تجرید" کو ترجیح دینے لگے اور بودھ "دھاڑوں" کی طرح ان کے ہاں بھی مونسٹریز تعمیر ہو گئیں۔ (MONASTRIES) جہاں راہب اور راہبہ یاد خدا میں مشغول رہتے "گبن" اپنی تاریخ زوال روما الکبریٰ میں لکھتا ہے کہ "حیرت ہے کہ رہبان نسل انسانی بڑھانے کے بغیر بڑھتے ہی جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ترک دنیا سے دنیا زیادہ سے زیادہ ملتی ہے"۔ وہ اس پر بھی اظہار تعجب کرتا ہے کہ "کسی شریعت کے قوانین میں ایسی سخت سزائیں نہیں جو رہبان اپنے نفس پر بخوشی خاطر جائز سمجھتے ہیں کہ یہ کار ثواب ہے" اسے وہ "نفس کشی" سے تعبیر کرتے ہیں۔ بظاہر یہ قیاس مع الفارق معلوم ہوتا ہے کہ نفس کشی میں تن آسانی بھی ہے۔ باوجود قدرت عمل بیکاری اور کاہلی کو ترجیح دینا اور خانہ داری کے جھمیلوں میں نہ پڑنا اور ان تکالیف اور مصائب سے جی چرانا جو روزمرہ "اہل دنیا" کا حصہ ہے، اگر نفس کشی اسی کا نام ہے تو اس کا کیا علاج کہ تمدنی زندگی سے کنارہ کش ہو کر بھی فطرت کا شدید مطالبہ شکم کر رہا ہے۔ سنیاسی یا رہبان اپنی ہم جنس انسانوں سے قطع تعلق کر سکتے ہیں اور کر رہے ہیں لیکن اشیاء کائنات سے جو معدہ کی تسکین کا موجب ہیں تعلق قطع نہیں کر سکتے، اس کا علاج اور واحد علاج یہ ہے کہ اہل دنیا کا فرض ہے کہ ان تارکان دنیا کی خدمت مال و اولاد سے کریں۔ ان کی نجات کا یہی ایک وسیلہ ہے۔ سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان کے مشہور شہروں پر سترہ حملے کئے۔ اسکی توجہ کا مرکز عموماً مندر تھے جہاں مال و دولت اتنا جمع رہتا کہ راجوں کے خزانوں میں بھی اتنا روپیہ نہ تھا۔ راجے اور امرا اپنی لڑکیوں کو مندروں کی "سیوا" کیلئے وقف کر دیتے، ان کو رقص و سرود کی تعلیم دی جاتی کہ زائرین کی کشش کا اس سے بڑھ کر سامان نہ تھا۔

اس میں کچھ کلام نہیں کہ ہر ایک نیک کام کی ابتدا شغف عبادت اور خدمت خلق سے ہوتی رہی۔ بعض لوگ اپنی زندگی اسی نیک کام کیلئے وقف کر دیتے، ایسے مہاتماؤں کا احترام ہر ایک شخص پر واجب تھا۔ بلکہ ہر ایک شخص ان کی خدمت کار ثواب یقین کرتا۔ یہ لوگ لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتے۔ راجے مہاراجے بھی ان سے دبتے۔ جب کبھی کوئی لنگوٹ باندھے جٹا دھاری کسی راجے کی دربار میں آنکلتا تو راجہ سنگاسن سے اتر کر اس کے پاؤں پڑتا اور ہاتھ باندھے کھڑا رہتا کہ مہاراج فرمائیں کیا "اچھا ہے" پیٹ سے بڑھ کر عزت کا بھوکا ہر ایک نفس ہے، لیکن

فیض معنی درخور تعلیم ہر بے مغز نیست　　نشہ را چوں بادہ تواں در دل پیمانہ ریخت

"ہر کسے را بہر کارے ساختند" لیکن جس کام میں عزت اور حکومت کا چٹخارہ بھی ہو تو ہر ایک نا اہل بھی ادھر ہی کھچا چلا آتا ہے اور اس طرح ہر ایک نیک کام نفس پرستی کا روزگار یا پیشہ بن جاتا ہے اور پیشہ ور رہبان اور سیاسی اور سادھو وغیرہ کثرت سے پیدا ہو جاتے ہیں جس قوم میں ایسی بیکار جماعت کی کثرت ضرورت سے زیادہ ہو وہ تباہ ہو کر رہ جاتی ہے۔

شریعت موسوی میں بھی ایسے لوگوں کیلئے گنجائش رکھی گئی تھی جو محض عبادت اور خدمت خلق بتعلق تعلیم دین اپنی تمام یا زندگی کا کچھ حصہ "تجرید" میں بسر کریں، لیکن ایسی مثالیں شاذ ہی ملتی ہیں منو کے دھرم شاستر میں برہمنوں کا فرض تھا کہ عمر کا آخری حصہ کار خیر میں صرف کریں۔

ہمارا مقصد یہ نہیں کہ رہبانیت کی تاریخ لکھیں، یہ ایک مستقل موضوع ہے۔ غرض یہ ہے کہ قارئین کرام پر واضح کریں کہ غیر اسلام مذاہب کا اثر ہمارے عقائد پر بحیثیت مسلم کیا ہوا اور ہم فرائض پر نوافل کیوں اور کس طرح زیادہ کرتے گئے۔

اس میں بھی کچھ کلام نہیں کہ مسیحیت میں عقیدہ "تثلیث" آریائی ہے، ہندوؤں کی "تری مورتی" اور یونانیوں کی "تری آڈ" (TRIAD) اور ایرانیوں کی "دوئی" توحید کے مخالف ہے جو ذریت ابراہیم بنی اسمٰعیل اور بنی اسرائیل کی ملت کی بنیاد ہے، اگر پولوس آریائی تری مورتی کا "پرچار" کرتا تو یہ تفرقہ جو اس نے "مسیحیت" کے نام سے یہود و نصاریٰ میں پیدا کر دیا رونما نہ ہوتا، اس نے نصاریٰ کی محبوب ترین شخصیت حضرت مسیحؑ کو "الوہیت" کا درجہ دیا، حواری تو اس دجل کا شکار نہ ہو سکتے تھے لیکن ایک دو نسل گذرنے کے بعد یہ عقیدہ پختہ ہو گیا کہ مسیح کی واحد شخصیت پر ایمان ہی مدار نجات ہے۔ امم آریہ میں ایسے دیوتاؤں کی کمی نہ تھی جو بلا واسطہ پیدا ہوئے، کچھ عرصہ انسانوں میں انسانی شکل و صورت میں رہے، پھر کسی خدائی مصلحت کے تحت روپوش ہو گئے اور اب تک زندہ ہیں، ہندوؤں میں اوتار اسی خدائی خاندان کے ارکان ہیں جب دنیا گناہوں سے بھر جاتی ہے تو اسے پھر سے پاک صاف کرنے کیلئے جنم لیتے ہیں۔ چونکہ مسیحی زیادہ تر امم آریہ ہی تھے اور یہ عقیدہ ارث میں ملا تھا اس لئے کسی دیوتا یا مہادیو کی جگہ مسیح کی "پوجا" کچھ الجھن کا موجب نہ تھا۔

ان تاریخی حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ تاریخ ایسے واقعات کا اعادہ کس طرح اور کیوں کرتی ہے؟ میرے ایک ہندو دوست نے "دام مارگ" (جس کی بنیاد شیو پوجا ہے) پر اظہار حقائق کرتے ہوئے کہا کہ دام مارگیوں نے تمام ہندو رشیوں منیوں اور آخر میں کرشن جی کو اسی رنگ میں پیش کیا جو ان کے اپنے عقیدہ کا تھا کہ کرشن جی گوپیوں کے ساتھ "برج" میں رنگ رلیاں مچاتا تھا۔ یہ عقیدہ ہندوستان بھر طول و عرض میں شیو جی کے ساتھ پھیل گیا۔ اور آج شاید ہی کوئی ہندو ہوگا جو شیو کا پجاری کسی نہ کسی رنگ میں نہ ہو۔ "دام مارگیوں" کے آلات کار سب تفریح کے سامان تھے جو "فنون لطیفہ" نے پہلے ہی مہیا کر رکھے تھے۔ شعراء نے ڈرامے لکھے جن کو "سٹیج" (STAGE) کیا جاتا اور عوام کا بے پناہ ہجوم کھچا آتا۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ خلیفہ حضرت معین الدینؒ اجمیری نے اپنے ہمعصر قاضی القضاۃ شیخ حمید الدین ناگوریؒ سے فتویٰ طلب کرتے ہوئے لکھا کہ ہماری مجلس وعظ میں ہندو کثرت شریک ہوتے ہیں۔ یہ زیادہ تر راگ رنگ کے دلدادہ ہیں اگر یہ جائز ہو تو ہماری محفل بھی گرم ہو سکتی ہے۔ قاضی صاحب نے لکھا کہ خوش الحانی تو ممنوع نہیں ہے اگر اتنے ہی سے کام لیا جائے اور ایسا کلام جس کا موضوع توحید اور اخلاق حسنہ ہو خوش الحان پڑھیں تو مضائقہ بھی نہیں، لیکن اس کے ساتھ "مزامیر" قطعاً نہ ہوں، خواجہ صاحب نے اسی پر اکتفا کیا اور مجلس بھی گرم ہو گئی اور اشاعت اسلام جو اصل غرض تھی پوری

لیکن نفس انسانی تو حظ کا اور حظ میں کثرت کا طالب ہے امیر خسروؒ نے "قول" (قوالی) اختراع کی، فنون لطیفہ میں سے شاعری اور موسیقی کے استاد تھے، کئی راگنیاں بھی اختراع کیں، آج چشتیہ حلقہ میں "وجد و حال" یہی شاعری اور موسیقی جس کو صوفیہ "سماع" سے موسوم کرتے ہیں امتیازی شان رکھتی ہے۔

یہ نفسیات کا اہم مسئلہ ہے کہ کسی تحریک کو خواہ وہ کیسی ہی فی نفسہ مذموم ہو اگر کامیاب کرنا ہو تو اسے مذہبی رنگ میں پیش کرنا چاہیے جیسا کہ "دام مارگیوں" نے کیا، اور ہر ایک تحریک جو انتہائی پسندیدہ ہونا کامیاب ہو کر رہ جاتی ہے اگر اسے لہو و لعب میں بدل دیا جائے بلاشبہ حالات ایسے پیدا ہو جاتے ہیں کہ کمتر درجہ کی برائی اختیار کرنی پڑتی ہے (CHOICE OF EVIL) لیکن قرآن حکیم مسلمانوں کو برائی نہیں

سکھاتا خواہ یہ کمتر درجہ کی ہو، ان حالات میں بھی جو ناگزیر ہیں" تقوی" کی تعلیم دیتا ہے خواہ "ادنی" ترین درجہ کا ہو، جیسا کہ جارہ" نکاح" تک کی رخصت ہے اور ہر ایک امر میں "تعدیل" پر زور دیتا ہے کہ عدل ہی تقوی سے لگا کھاتا ہے "تپسوی" مجاہدہ صافہ اور ریاضت شاقہ بخوشی خاطر برداشت کرتا ہے لیکن عدل قائم نہیں رکھتا۔

"تعدیل بہر امر کمال عرفاست"

افراط و تفریط سے بچنا ہی تقوی ہے۔ قوتِ غضبی کو اگر اعتدال پر رکھا جائے تو "شجاعت" ہے اور اگر بے لگام چھوڑ دیا جائے تو انسان درندہ ظالم بن جاتا ہے۔ قوت شہوانی پر اگر اعتدال کار فرما ہو تو انسان ہر ایک بے حیائی کا مرتکب ہوتا ہے اور اگر عدل کی حدود میں ہو تو "عفت" ہے۔ ہمارے جسمانی قوی میں اگر اعتدال نہ ہو اور ایک قوت دوسری قوت پر غالب ہو تو فساد رونما ہوگا اور انسان امراض کا شکار ہو جاتا ہے، اسی طرح ہمارے نظام معاشرت کی کیفیت ہے، اس عالم اضداد یعنی کائنات میں اللہ تعالیٰ نے "میزانِ عدل" رکھ دی ہے اور قرآن ہدایت فرماتا ہے کہ تم بھی اپنے معاملات میں عدل وقسط ملحوظ رکھو اور افراط و تفریط سے بچو (سورۃ الرحمن) "كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا" کھاؤ پیو مگر اسراف سے کام نہ لو۔ بہر حال اسلام میں کسی جائز مقصد کیلئے ناجائز وسائل استعمال کرنا ممنوع ہے پولوس کی انجیل میں جائز ہے۔

اس تشریح کے بعد دیکھنا یہ ہے کہ "اسلام" پر ہمسایہ اقوام کی ثقافت کا کیا اثر ہوا اور انھوں نے اسلام کا اثر کس حد تک قبول کیا؟ خلافت راشدہ کا تصادم دو عظیم الشان ہمسایہ سلطنتوں سے ہوا، ان کا تمدن جیسا قدیم تھا ویسا ہی اعلیٰ درجہ پر تھا، ان میں سے ایک "رومی" (در اصل یونانی) یورپ اور ایشیائے کوچک اور شام اور افریقہ کے شمالی حصہ پر مسلط تھی۔ دوسری ایرانی، ایک طرف شمالی ہندوستان (پنجاب اور سندھ) اور دوسری طرف "الجزیرہ" (عراق) عرب کے جنوب مغربی ساحل اور "یمن" پر قابض تھی، دونوں کا تعلق امم آریہ سے ہے، یونانیوں کا رائج دھرم نام نہاد مسیحیت اور ایرانیوں کا "زرتشتی" مذہب تھا، ایک کی صورت پولوس نے مسخ کی اور دوسرے کا حلیہ مانی اور مزدک نے بگاڑا۔

مانی

آنحضرتؐ کے عہد رسالت میں ایران اور اس کے مقبوضات پر "ساسانی" خاندان حکمران تھا۔ اس خاندان کے بانی اور اول تاجدار "اردشیر بابکان" (۲۱۲ء-۲۲۶ء) کی تخت نشینی سے قریباً تین سو سال پیشتر سکندر اعظم یونانی نے مملکت ایران مسخر کرلی۔ آتش کدہ "اصطخر" میں "اوستا" کا قلمی نسخہ بارہ ہزار اوراق چرم پر سنہری حروف میں لکھا ہوا موجود تھا۔ سکندر نے جہاں اور غارتگری کی ایرانی تمدن کو خاک میں ملا دیا اور یہ نسخہ بھی نذر آتش کردیا، ملک کے طول و عرض میں کوئی اور نسخہ نہ تھا۔ اردشیر نے پیشوایان دین زرتشتی سے درخواست کی کہ "اوستا" کی تدوین کی جائے، "موبدون" نے تلاش کے بعد ایک نوجوان "اردا ویراف" نامی کو پیش کیا اور کہا کہ یہ ایسی معصوم شخصیت ہے جس نے مدت العمر کوئی گناہ صغیرہ و کبیرہ نہیں کیا اور یہی ایک اس لائق ہے کہ حضرت زرتشت کے باریاب ہو کر "اوستا" شروع سے آخر تک حضرت ہی کی زبان سے سنے اور یاد رکھے، چنانچہ نوجوان کو آتشکدے میں لائے، ایک چارپائی پر لٹایا اور "اوستا" کے منتر جو بھی یاد تھے پڑھتے رہے، نوجوان پر بیہوشی طاری ہوئی اور تین دن اسی حالت سکتہ میں رہا جب ہوش میں آیا تو کہا کہ کاتبوں کو بلاؤ جو کچھ میں کہوں لکھتے جائیں چنانچہ اس نے پہلے اپنی سرگذشت "معراج" سنائی کہ "سروش" (فرشتہ) آیا اور مجھے پہلے "پل چینوت" (پل صراط) پر لے گیا جو بال سے باریک تر اور تلوار سے تیز تر ہے

پل دوزخ پر ہے، میں نے اہلِ دوزخ کو عذاب میں دیکھا۔ یہاں سے فرشتہ مجھے "مینو بہشت میں لے گیا۔ یہاں سے آسمانوں کی سیر کی اور آخر حضرت زرتشت کے تخت زریں کے سامنے آیا۔ آپ نے مجھے "اوستا" شروع سے آخر تک سنایا اور یاد کرایا۔

تذکرہ "ارداویراف" ایک کتاب "ارداویراف نامک" پہلوی زبان میں مذکور ہے۔ بمبئی ۱۸۷۲ء میں چھپی، ترجمہ انگریزی اور فرنچ زبانوں میں بھی موجود ہے۔ "دبستان مذاہب" میں جو محسن نامی کشمیری استاد غنی کشمیری اور ہمعصر غازی اورنگ زیب عالمگیر سے منسوب ہے "قصہ معراج ارداویراف" بیان کیا گیا ہے۔

مانی اردشیر بابکان کے عہد میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ "پاتک" (معرب فتق) ایرانی ہمدان کا باشندہ تھا۔ نقل مکانی کے بعد "بابل" میں آیا۔ اس جگہ "صابی" مذہب کے پیرو بہت تھے، عرب ان کو "مغتسلہ" کہتے کیونکہ صابی اکثر غسل کرتے اور اسی لئے دریاؤں کے کنارہ پر ان کی رہائش عموماً تھی۔ پاتک کو ان کے جسم کی صفائی اور لباس کی پاکیزگی بہت پسند آئی انہی کا مذہب اختیار کیا۔ ان لوگوں کی زبان "آرامی" تھی جو عربی کے اقرب ہے۔ پاتک نے اپنے بیٹے مانی کو بھی انہی کے حلقہ ارادت میں داخل کردیا۔ مروجہ پارسی تو مادری زبان تھی۔ مانی کو آرامی زبان پر بھی کامل عبور تھا۔ انجیل اور اکثر صحفِ انبیاء کی زبان بھی مخلوط آرامی و عبرانی تھی۔ توراۃ کی خالص عبرانی زبان مردہ ہو چکی تھی۔ مانی ان کتب مقدسہ سے بھی خوب واقف تھا۔ تحقیق مذاہب کا شوق اسے مختلف ممالک کی طرف رہنما ہوا۔ ایران کے طول و عرض میں پھرا۔ شرقی حصہ میں "بدھ مت" کے پیرو بہت تھے اور بدھ مت اور زرتشتی مذہب کا اختلاط بہت عرصہ پہلے شروع ہو چکا تھا۔ "آتشکدہ نوبہار" دراصل "وہاردھاڑا" بودھوں ہی کا تھا۔ ہمارے ہندوستان کا صوبہ "بہار" یہی "وہار" بدھ مت کا ہے اور اس جگہ اس مت کا کبھی بہت زور تھا پنجابی میں "ویڑا" (صحن خانہ) یہی لفظ ہے۔

اچھی اچھی باتیں کم و بیش ہر ایک مذہب میں کشش کرتی ہیں۔ مانی کو بودھ مت میں طریقۂ عبادت پسند آیا۔ اس نے ایرانی مذہب زرتشتی اور مسیحیت اور صابی مذہب اور بدھ مت کی نمایاں خصوصیات سے ایک معجون مرکب تیار کی، اور اردشیر کے بیٹے اور جانشین شاہ پور (۲۴۳ء) کے عین تخت نشینی کی تقریب پر اپنے مذہب کا اعلان کردیا۔ اس سے پیشتر مانی اپنے مذہب کا پرچار خاموشی سے کرتا رہا اور شاہ پور کا بھائی "فیروز" اس کے حلقہ ارادت میں داخل ہو چکا تھا اسی کی وساطت سے مانی شاہ پور کے حضور بھی باریاب ہوا۔ شاہ پور نے مانی مذہب اختیار کرلیا اور اس طرح یہ راج دھرم ہوگیا۔

ابوریحان بیرونی "الآثار الباقیہ" میں ابن ندیم کی کتاب "الفہرست" کے حوالے سے لکھتا ہے کہ مانی نے سات کتابیں تصنیف کیں ایک "شاہ برقاق" پہلوی میں اور باقی چھ "کتاب الہدی والتدبیر" اور "سفر الاسرار" اور "سفر الجبابرہ" وغیرہ آرامی زبان میں تھیں مصوری کے فن میں کامل تھا اور اسی کو اپنا معجزہ کہتا، اسے "ارژنگ مانی" سے موسوم کیا جاتا ہے۔ غالباً مصوری اس نے چینیوں سے سیکھی۔

بیرونی مانی کی چند کتب کا مطالعہ کر چکا تھا وہ کہتا ہے کہ اس کی ہر ایک تصنیف میں یہ دعوی ہے کہ ہر ایک زمانہ میں لوگوں کی ہدایت کے لئے پیغمبر مبعوث ہوتے رہے۔ اسرائیلیوں میں مسیح، ہندوستان میں بودھا، ایرانیوں میں زرتشت کا ظہور ہوا۔ اس زمانہ میں میری

بعثت بابل میں ہوئی، ہر ایک قوم وملت کے لوگ ایک پیغمبر کی آمد کے منتظر ہیں، میں ہی عیسائیوں کا "فارقلیط" وغیرہ ہوں۔ یہودیت کے سخت مخالف تھا حضرت مسیحؑ کے بارہ میں اس کا وہی عقیدہ مسیحیوں کا تھا کہ آپ صلیب پر فوت نہیں ہوئے آپؑ خدائے نورؑ کے فرزند تھے، صلیب پر آپ کی شبیہ "پسر ظلمت" مارا گیا اور آپ زندہ آسمان کی طرف اٹھائے گئے۔

مانی نے اپنے متبعین کے پانچ درجات مقرر کئے (۱) معلمون (۲) مشموّن (سورج دیوتا کے پجاری) (۳) قسیسون (ملا پادری وغیرہ) (۴) صدیقون (۵) سموّن۔ پروفیسر آرتھر کرسٹن سین بھی یہی پانچ طبقات لکھتا ہے نام مختلف ہیں مفہوم ایک ہی ہے (۱) فرستگان (فرشتے) ان کی تعداد بارہ تھی (۲) اسپسگان (قسیسون) تعداد بہتر تھی۔ (۳) مہشگان (زنگان دین) تعداد تین سو ساٹھ تھی۔ (۴) ورزیگان (برگزیدگان) (۵) نیوشگان (سماعون) عوام، آخرالذکر دو کی تعداد لامحدود تھی۔

پانچوں طبقات کے فرائض میں نماز پنجگانہ فرض قرار دی گئی۔ نوافل بقدر کثرت کار ثواب تھا۔ موسوی دس احکام شریعت ارکان دین تسلیم کئے۔ شرائط ایمان وعمل چار خاص ہیں (۱) یزداں پر ایمان (۲) چار یا سات روزے (۳) تثلیث ترک یعنی ترک خیالات بد، ترک اقوالِ بد، ترک اعمالِ بد۔ (۴) ان کی ضد نیک خیالات ونیک اقوال ونیک اعمال۔ زرتشتی مذہب میں یہ "ہوفت" اور "ہورشت" اور "ہورنشت" سے موسوم ہیں۔

زرتشتی مذہب کی صورت مانی کے زمانہ میں بہت کچھ پہلے ہی مسخ ہو چکی تھی مگر "دوئی" کا عقیدہ مانی نے بھی اپنایا، یعنی نور وظلمت دو قدیم اصول ہیں۔ ابتدا میں دونوں الگ الگ تھے ان کی آویزش شروع ہوئی تو آخر آمیزش بھی ہو گئی۔ نور ہر ایک نیکی کی اصل ہے اور ہر ایک برائی کی جڑ ظلمت ہے، اور انہی کے اختلاط کا نتیجہ ہے کہ انسان میں دونوں باتیں پائی جاتی ہیں۔ نور کا غلبہ ہو تو نیکی اور نیک انسانوں کی عالم انسانی میں اکثریت ہوگی اور اس کے خلاف ظلمت کا غلبہ ہو تو بدی اور بدکاروں کا غلبہ ہوگا۔ نورؑ اہورمزدا (یزداں) اور ظلمت اہرمنوش (اہرمن) اور ان کی ذریت اپنے اپنے احاطۂ سلطنت میں فرشتے اور دیو ہیں جن میں جنگ آفرینش سے جاری ہے۔ نور وظلمت کے امتزاج سے جو مادی دنیا کا ظہور ہوا اسی تخیل کے تحت تصوف میں "موسیٰ وفرعون باہم جنگ شد" چراغ مصطفویؐ اور شرار بولہبی کا مقابلہ ومقاتلہ ہوا۔

ظلمت نے نور کو اپنے دام فریب میں مقید کیا ہوا ہے۔ مخلصی کی صورت ترک دنیا تجرد کی حد تک ہے۔ نفس کشی سے نور اپنے اصل سے وصل ہو جائیگا اور فرشتے جو ارض وسماوات کو ظلمت کی محکومی میں تھامے ہوئے ہیں اپنی گرفت جب نور کا غلبہ ہوگا ڈھیلی کر دیں گے تو قیامت برپا ہو جائیگی نوری پیدائش مینو بہشت میں اور ظلمت کی ذریت دوزخ میں اپنے اصل سے جا ملے گی۔

شاہ پور کے عہد میں جب مانی کا مذہب رائج دھرم ہو گیا تو جیسا راجہ ویسی پرجا، ایران کے طول وعرض میں سرعت سے پھیل گیا زرتشتی مذہب کے اکابر موبد وغیرہ کا ایک وفد شاہ پور کی خدمت میں حاضر ہوا اور کوشش کی کہ شاہ پور اپنا آبائی مذہب ترک نہ کرے مگر مؤثر نہ ہوئی۔ آخر مباحثہ کی ٹھہری، مانی ہار گیا۔ شاہ پور نے توبہ کی اور مانی کو جلاوطن کیا گیا۔ ایران سے نکل کر وہ ہندوستان میں آیا۔ دونوں ممالک میں سیاسی اور تجارتی اتحاد کی صورت بھی تھی۔ شاہ پور مر گیا تو اس کا بیٹا اور جانشین ہرمز بھی ایک سال کے بعد فوت ہو گیا

ہرمز کا بیٹا "بہرام" تخت نشین ہوا تو خیر خواہوں نے مانی کو مطلع کیا کہ واپسی کیلئے حالات سازگار ہیں؛ مانی ایران میں آیا، کچھ عرصہ وہ اور اس کے چیلے سرگرم تبلیغ رہے۔ موبد پھر بہرام کے پاس آئے اور پھر مباحثہ شروع ہو گیا۔ مانی اب بالکل تیار تھا "بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے" جب موبدوں نے دیکھا کہ مانی کے دلائل کا جواب نہیں تو ایک نے جرأت رندانہ سے کام لیا اور کہا سچے اور جھوٹے میں تمیز اس طرح ہو سکتی ہے کہ سیسہ پگھلا کر دونوں کے پیٹ پر ڈالا جائے، جھوٹا سچے کے سامنے مرے۔ مانی نے کہا یہ امتحان کا طریقہ ظلم و ظلمات کے مناسب دلیل ہے، بادشاہ سمجھ گیا کہ مانی پہلو بچانا چاہتا ہے، مانی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تو نے ایک تو میرے دادا کے حکم کی خلاف ورزی کی، اور بلا اجازت ایران میں داخل ہوا اور میری رعایا میں شر انگیز تفرقہ برپا کیا، دوسرے تو کہتا ہے کہ یہ مادی دنیا برائی کا گھر ہے اس کو تباہ کرنا چاہئے کیوں نہ اس کی ابتدا تجھ ہی سے ہو۔

مانی قید ہوا اور قید خانہ ہی میں نہایت عذاب سے قتل کیا گیا، اب اس کے مریدوں پر آفت آئی جو بچے کچھ دریائے بلخ کے پار خاقانِ چین کے ہاں پناہ گزیں ہوئے اور کچھ اپنے مقدس مقام بابل میں روپوش ہو گئے اور "تقیہ" اختیار کیا۔ "پنہاں خورید بادہ کہ تکفیر می کنند"۔

مزدک قریب تین سو سال کا عرصہ گذر گیا۔ ساسانی بادشاہ قباد تخت نشین ہوا۔ ساسانی عظمت و شان اس وقت منتہائے عروج پر تھی علمائے دین زرتشتی کو حکیم "مزدک" کے افکار عالیہ نے چونکا دیا۔

تین سو سال کے عرصہ میں مانی کے خلاف جذبات بہت کچھ ٹھنڈے پڑ چکے تھے، مانی کے متبعین علانیہ تو نہیں لیکن خفیہ ریشہ دوانی میں سرگرم عمل تھے۔ زرتشتی عقائد میں بہت کچھ فرق آ چکا تھا۔ حکیم مزدک نے زرتشتی یا مانوی مذہب کو بحال رکھتے ہوئے اتنی ترمیم کر دی کہ ترک دنیا کوئی ضروری جزو دین نہیں۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس وقت تک جتنے پیغمبر گذرے کسی نے ایرانیوں کے ادنیٰ طبقہ کی طرف توجہ نہیں کی، حالانکہ اکثریت انہی کی ہے۔ اگر ان کو ابھارتے تو یہ اتنے خستہ حال نہ ہوتے جیسا کہ ہیں۔ مزدک نے "اشتراکیت کی انتہائی صورت "کمیونزم" کو اپنی رسالت کا اصل اصول قرار دیا اور اس کو مذہبی رنگ میں پیش کیا۔ کمیونزم کو منطقی نتیجہ تک لا کر کہا کہ عورت مرد کی طرح آزاد ہے۔ میری پیغمبری کا منشا یہ ہے کہ مرد و زن میں مساوات قائم کر دوں، بے جوڑ عقد نکاح جیسا کچھ رائج ہے ناواجب ہے۔ زردار بوڑھا کھوسٹ نوعمر خوبصورت بیاہ لاتا ہے واجب ہے کہ ایسا شخص اپنی زوجہ کو کسی نادار خوبصورت تنومند کے ہاں کبھی کبھی بھیج دیا کرے شادی بیاہ میں حسن صورت اور تنومندی کا لحاظ رکھنا چاہئے ناواجب ہے کہ خوبصورت مردوں کے ہاں کریہہ منظر عورتیں ہوں۔

یہ طریقہ کچھ نیا نہ تھا اہم آریہ میں نکاح کی قسم کا رائج تھا۔ بزور زر اور بزور بازو (اغوا) جائز نکاح تھا اور ہندوستان میں ایک جماعت ایسی بھی تھی جو اسی غرض کے لئے پرورش کی جاتی جیسے اچھی نسل کے بیل اور گھوڑے اصطبل میں رکھے جاتے ہیں۔ فلسفہ یہ تھا کہ قوم خوبصورت تنومند ہو اور "نیوگ" جسے مزدک نے اپنایا عام تھا۔ "شیوجی" اور یونانی دیوتا بکس (BACHUS) یا ڈائی نوسیس (DIONOSIUS) میں مماثلت حیرت انگیز ہے۔ روایات سے پایا جاتا ہے کہ عالم مستی میں اس نے مصر اور ایران اور ہندوستان کا بھی سفر کیا اور ہندوستان میں کئی سال رہا۔ دس روز اس کی "ہولی" یونان میں بھی منائی جاتی اور وہ تمام رسوم ادا کی جاتیں جو بظاہر بے حیائی مگر اسرار مذہب سے تعبیر ہوتی ہیں۔

قباد نے مزدکی مذہب قبول کیا تو یہ راج دھرم ہو گیا۔ عورتوں میں یہ مذہب بہت مقبول ہوا۔ موبدوں نے دیکھا کہ ان کا اقتدار خاک میں مل رہا ہے اور طبقہ امراء برافروختہ تھا کہ مذہب ان کے منہ آ رہے ہیں، عورتیں اتنی خود سر ہیں کہ کھلے بندوں نامحرم لوگوں سے اختلاط بڑھ رہا ہے۔ اس لئے موبدوں اور امراء کی سازش کامیاب ہوئی۔ قباد کو تخت و تاج اپنے بھائی "جاماسپ" کے حق میں چھوڑنا پڑا۔ دژ فراموشی" میں نظر بند رہا لیکن اس کا بیٹا خسرو جو بعد میں "نوشیرواں" کہلایا اور اس کا اتالیق حکیم بزرجمہر مزدک کے سخت مخالف تھے اس وقت آڑے آئے، خسرو نے اپنے نانا شاہ ترکاں کی مدد سے "دژ" کو محاصرہ میں لے لیا۔ قباد کو خلاصی نصیب ہوئی تو موبدوں کو بھی راضی کر لیا اور علانیہ مزدکی مذہب سے توبہ کی، تخت و تاج دوبارہ ملا۔ مزدکی مذہب اس کے اپنے شاہانہ مفاد کے خلاف تھا۔ حریت و مساوات مذہباً اور عملاً تسلیم کی جائے تو شاہی کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے لیکن اس کا سیاسی تدبر مزدک اور مزدکیوں کو اپنا آلہ کار موبدوں اور امراء کا زور توڑنے کیلئے بنانا چاہتا تھا کہ بادشاہ بھی ان کے ہاتھ کی کٹھ پتلی تھے جس کو چاہا تخت پر بٹھا دیا جسے چاہا اتار دیا۔ اس لئے اس کے دورِ حکومت میں اگرچہ یہ مذہب راج دھرم نہ رہا مگر رواداری سے کام لیا۔ مگر شہزادہ خسرو اور بزرجمہر اس مذہب کو بیخ و بن سے اکھاڑنا چاہتے تھے اور اس کا علم مزدک کو بھی تھا۔ نوشیرواں یہ سیاسی چال چلا کہ مزدک کو یقین دلایا کہ مجھ سے غلطی ہوئی کہ اپنے باپ کے عقیدہ کے خلاف مزدک کے حکیمانہ ارشادات کی طرف مناسب توجہ نہ کی لیکن اب مجھے اس کا افسوس ہے اور میں چاہتا ہوں کہ علانیہ اسے راج دھرم قرار دوں۔ مزدک چکمہ کھا گیا مزدک اور اس کے اکابر کو ضیافت کی دعوت دی گئی اور قرار پایا کہ اس تقریب پر نوشیرواں اپنی "شدھی" کا اعلان کرے گا۔ مزدک آیا اور نوشیرواں نہایت عزت و احترام سے علیحدہ کمرہ میں لے گیا۔ غرض یہ تھی کہ مزدک سے تنہائی میں گفتگو مسائل دین پر ہو، قصر ابیض کے پائیں باغ میں مزدکی جمع تھے کہ شاہی سپاہیوں نے گھیرے میں لے لیا۔ گڑھے پہلے ہی کھود لئے گئے تھے۔ سر نیچے اور پاؤں اوپر سب کو ان میں دفن کیا گیا۔ زمین کے اوپر صرف ان کے پاؤں باہر تھے، اتنے میں نوشیرواں بھی مزدک کے ساتھ یہاں پہنچ گیا اور ان پاؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "یہ بیج آپ ہی کا بویا ہوا ہے اور یہ بار آور ہو رہا ہے"۔ سپاہیوں نے مزدک کو بھی باندھ لیا اور اسی طرح اسے بھی زندہ درگور کیا گیا۔ یہ واقعہ ۵۲۹ء کے آغاز کا ہے لیکن مزدکی اس طرح ختم نہ ہو سکتے تھے، مرض کا علاج سہل ہے اگر جسم کے کسی حصہ پر نمودار ہو۔ اگر جسم کے اندر پوشیدہ ہو تو خطرناک بھی ہے۔ جب ۵۳۱ء میں نوشیرواں تخت نشین ہوا تو مزدکیوں کا قتل عام بھی ہوا، یہ بھی جہاں جس کے سینگ سمائے روپوش ہو گئے۔

اس وقت ساسانی شہنشاہیت منتہائے عروج پر تھی، لیکن تاریخ اس واقعہ کا ہمیشہ اعادہ کرتی رہتی ہے کہ کسی اولوالعزم فاتح یا حکمران کے بعد حکومت کا زوال شروع ہو جاتا ہے اس لئے کہ جانشین اس کے دل و دماغ کے آدمی نہیں ہوتے اور باپ کی کمائی سنبھال نہیں سکتے۔ نصف صدی تک ساسانی شہنشاہیت سنبھالا لیتی رہی آخر اس کا چراغ خلافتِ راشدہ نے گل کر دیا۔

جہاں تک ہمارے موضوع کا تعلق ہے ہم نے بالاختصار پولوس اور مانی و مزدک کے حالات بیان کئے ہیں۔ اب دیکھئے کہ مسلمانوں کے عقائد پر اس کا اثر کس حد تک ہوا۔ اگرچہ یہ داستان بہت طویل ہے مگر مختصر عرض کرتا ہوں۔

ایرانی ثقافت تو سکندر یونانی بہت عرصہ پہلے تباہ کر چکا تھا لیکن شاہی عظمت ساسانیوں نے دوبارہ حاصل کر لی بلکہ سلف سے

کچھ بڑھ چڑھ کر تھی۔ عربوں نے جب اسے ختم کردیا تو ابتدا میں مسلح بغاوتوں سے کام نہ چلا تو خفیہ ریشہ دوانی سے کام لیا اور یہ حربہ کارگر رہا۔ اسلام تبلیغی دین ہے اور اموی خلافت عربی زبان اور اسلام کی اشاعت میں انتہائی سرگرمی سے کام لے رہی تھی۔ ایک انگریز مورخ لکھتا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس خلافت کا مقصد عظیم و اولین یہی دو باتیں تھیں۔ تاریخی حقیقت بھی یہی ہے کہ اموی خلافت کے بعد دونوں کام رک گئے اور ان کے خاتمہ پر فتوحات کا سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔ بلکہ جانشین خلفائے عباسیہ مفتوحہ ممالک پر قبضہ ہی بحال نہ رکھ سکے۔ تمام شمالی افریقہ اور ایران اور ترکستان اور بلوچستان اور افغانستان اور سندھ اموی خلافت نے مسخر کئے اور یہاں اسلام بالاستقلال قائم ہوگیا۔ یہ توفیق پھر کسی مسلمان تاجدار کو نصیب نہ ہوئی۔ ہندوستان میں افغان حکومت نے بنگال اور پنجاب میں اسلام شائع کیا اور آج بھی ان دو صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ مغلیہ شہنشاہوں نے ہندوؤں کی سرپرستی اس حد تک کی کہ آج "بھارت" کا پرچم یہاں لہرا رہا ہے۔ پاکستان کی بنیاد افغانی حکومت نے رکھی تھی اور ان کی سعی مشکور ہوئی۔

محسن فانی نے "دبستانِ مذاہب" میں اور ہمارے زمانہ میں قاسم زادہ ایرانی نے "جلوہ ریزی روحِ ایران" میں یہ حقیقت واشگاف لفظوں میں واضح کی ہے کہ ایران نے اسلام تو قبول کیا مگر غرض یہ تھی کہ اس لباس میں دو عربی قریشی قبائل میں پھوٹ ڈال کر خانہ جنگی کی آگ بھڑکائی جائے اور اس کے ساتھ ایرانی اپنا کھویا ہوا اقتدار اور حکومت اور عظمت پھر سے حاصل کرلیں۔ یہی دو قبائل اس وقت برسرِ حکومت و اقتدار تھے، دونوں میں قرابت قریبہ بھی تھی اور حریفانہ چشمک بھی، شہادتِ حضرت عثمانؓ میں زیادہ تر انہی نو مسلم عجمیوں کا ہاتھ پوشیدہ کام کر رہا تھا۔ شام میں اموی امارت امیر معاویہؓ کی قیادت میں قائم ہوچکی تھی اور خالص عربی تھی، اس لئے عرب ہمیشہ اس کا پشت پناہ رہا، حضرت علیؓ کے ہوا خواہوں میں اکثریت عجمیوں کی تھی اور کوفہ ان کا مرکز تھا، اس لئے حضرت علیؓ نے دارالخلافت مدینہ منورہ سے کوفہ میں منتقل کرلیا، اس سے آپ عرب سے اتنا ہی دور تر ہوگئے جتنا ایران سے نزدیک تر ہوئے۔ یہ تاریخی حقیقت ہے اسے مذہبی نقطۂ نظر سے نہیں دیکھنا چاہئے۔

قاسم زادہ لکھتا ہے کہ ہمارے دانشمند بزرگوں کو نہ تو بنو فاطمہ سے عشق تھا اور نہ خاندانِ امیہ سے دشمنی تھی۔ مقصد تو اتنا ہی تھا کہ عرب حکومت کا تختہ الٹ جائے اور اپنی حکومت اور عظمت بحال کی جائے۔ چونکہ ہاشمی خلافت حضرت علیؓ کے بعد ختم ہوگئی اور اموی خالص عربی حکومت دنیائے اسلام کی مرکزی حکومت تسلیم کی گئی۔ عرب عجم پر بری طرح مسلط ہوگیا واحد چارۂ کار یہی تھا کہ ہم [illegible] تا ساتھ دیگران کو ابھارتے، ہمارے بزرگوں نے یہی کچھ کیا۔ قاسم زادہ اس کے بعد اپنے زمانے کے ایرانیوں کا رونا روتا ہے کہ ہوس، خالص اسلامی حکومت کے تحت وہ اپنا اصلی مقصد بھول گئے "صرف اہلِ بیت" کی محبت باقی رہ گئی نہ صرف ان کی ذہنیت بدل گئی بلکہ ہی لسان نے ہماری زبان پر بھی قبضہ کرلیا۔ یہ حقائق تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ ہمیں پھر سے اپنی پہلوی زبان کو زندہ کرنا چاہئے اور عربی الفاظ کے ساتھ عربی دین کو ایران کی حدود سے خارج کرنا چاہئے۔ یہ تحریک جہاں تک زبان کا تعلق ہے چل نکلی۔ محمد حسین آزاد مرحوم جب ایران میں گیا تو دیکھا کہ یہ تحریک زور پر ہے اس نے مشورہ دیا کہ "اعتدال سے کام لو غیر مانوس پارسی الفاظ کی بھرمار سے عوام جلدی ہی متنفر ہوجائیں گے"۔ حیدرآباد دکن میں ایک ایرانی ادیب نے "ترکتازانِ ہند" چند جلدوں میں

خالص پارسی زبان میں لکھی۔ ایک جلد فرہنگ بھی ہے۔ غالبؔ[1] مرحوم نے بھی "دستنبو" میں طبع آزمائی کی۔ بظاہر غرض یہی تھی کہ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔ امم آریہ میں "تشابہت قلوب" ہے، یہی تحریک اب بھارت میں زور شور سے جاری ہے اس کے ساتھ اسلام دشمنی بھی ہے۔

قاسم زادہ کے بزرگوں نے کیا کام کیا؟ یہ تاریخی واقعات ہیں اور ہم یہی بالاختصار قلم بند کرتے ہیں۔ محسن فانی نے "دبستان مذاہب" کا مواد براہِ راست اکابر مذاہب سے مل کر جمع کیا اور جو کچھ انھوں نے اپنے مذاہب کی خوبیاں بیان کیں وہی ضبط قلمبند کیں۔

زندیق

محسن فانی لکھتا ہے کہ مجھے مزدکی مذہب کے مبلغین سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا۔ یہ سب بظاہر مسلمان صوفی تھے اور بظاہر پیشہ طبابت وتجارت تھا۔ مستقل گبری نام شیداب وفرہاد وغیرہ کے ساتھ عارضی نام شمس الدین بھی تھے، یہ بھی اسی بات کا رونا روئے جس کا ماتم قاسم زادہ کرتا ہے کہ کیا غضب ہے کہ ہمارے بزرگوں نے عربی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور اب جبکہ ہماری قومی حکومت ہے اسلام اور عربی زبان ہمارے دل ودماغ پر بدستور قابض ہے۔ کتنا سیدھا سادہ ہمارا آبائی مذہب زرتشتی تھا اس کی جگہ اسلام کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئے۔

خلافت عباسیہ کے دور حکومت میں جب عربوں پر یہ راز کھلا کہ نومسلم عجمی اسلامی لباس میں وہی زرتشتی اور مانوی اور مزدکی عقائد کی اشاعت کر رہے ہیں تو ان کو "زندیق" سے موسوم کیا۔ محققین نے اس اصطلاح پر مفصل بحث کی ہے۔ بعض کا نظریہ یہ ہے کہ مانی کے پانچ طبقات میں سے ایک "صدیق" مجردانہ زندگی بسر کرتا، آرامی یا عربی زبان کا یہ لفظ ہے، پارسی میں "زندیک" ہو گیا۔ اور بعض کی تحقیق یہ ہے کہ زندیق لفظ "زند" کا معرب ہے، نومسلم مجوسیوں کے دل میں "ژند اوستا" رچا ہوا تھا اور اسی کا پرچار وہ مسلمانوں میں کرتے رہے۔ ژند اوستا کی تفسیر پہلوی زبان میں ہے۔

امم آریہ کے مذاہب کی نمایاں خصوصیات جو سب میں مشترک ہیں "تناسخ" اور "رجعت" اور "تشبیہ" ہیں اسلامی عقیدہ "توحید" کے تحت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسباب پیدا فرماتا ہے مگر خود سبب نہیں بنتا، خالق کائنات ہے مگر خود کسی مخلوق میں جسم نہیں لیتا۔ پولوس نے مسیح کو اسی رنگ میں پیش کیا جو تمام آریائی مذاہب کا ہے۔ اور یونانیوں اور رومیوں میں مقبول ہوا۔ خاتم النبیینؐ کے بعد جس کسی نے دعویٰ الوہیت ونبوت ورسالت کیا اور یہ زیادہ تر عجمی ہی ہیں انہی میں مقبول ہوا جو پہلے ہی حلول واتحاد وبروز وتشبہ کا عقیدہ پختہ کر چکے تھے۔ چنانچہ ہمارے زمانے میں جناب بہاء اللہ کا مذہب "بہائی" امریکہ میں مقبول ہو رہا ہے۔

یہ تاریخی حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کرنی چاہئے کہ آریائی تخیل دربارہ تناسخ ورجعت وتشبیہ سامی ذہن پر کبھی اثر انداز نہیں ہوا ذریت ابراہیمؑ خواہ یہود ہوں یا عرب اس سے بیگانہ ہی رہے چونکہ اسلام عالمگیر تبلیغی دین ہے اسلئے جب عجمیوں نے قبول کیا تو ان کو اسلام سے برگشتہ کرنے کیلئے اسی دجل سے کام لیا جو پولوس نے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا۔ بشری شخصیت پرستی تمام عجمی مذاہب میں قدر مشترک ہے، بیشتر اس کے کہ ہم بقول مقدس یوحنا حواری اس دجل کا پول کھولیں۔ چند مشہور تاریخی شخصیتوں کے بالاختصار حالات بیان کرتے ہیں جو اسلام کے خلاف سرگرم عمل رہے۔

---

[1] ہمارا خیال ہے کہ غالبؔ اس تحریک سے متاثر نہیں تھا۔ (طلوع اسلام)

عبداللہ بن سبا مصری

مورخین اسلام میں سے تاریخ خصوصی مذاہب اسلامیہ پر ابو منصور عبدالقاہر ابن طاہر البغدادی (متوفی ۴۲۹ھ) نے "الفرق بین الفرق" میں، اور سید تاج الدین ابوالفتح محمد ابن ابی القاسم عبدالکریم بن ابی بکر احمد شہرستانی (پیدائش ۴۶۷ھ وفات ۵۴۸ھ) نے "الملل والنحل" میں اور ابو محمد علی بن احمد بن سعید بن حزم (پیدائش ۳۸۴ھ وفات ۴۵۶ھ) نے "الفصل فی الملل والاہواء والنحل" میں، اور ابن خلکان (پیدائش ۶۰۸ھ وفات ۶۸۱ھ) نے "وفیات الاعیان" میں ان شخصیتوں کا تذکرہ لکھا ہے جن سے مذاہب اسلامیہ منسوب ہیں۔ شہرستانی "کیسانیہ" سے شروع کرتا ہے، اس سے پیشتر حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں عبداللہ بن سبا یمن کا باشندہ تھا، کہتے ہیں کہ یہودی تھا اسلام قبول کیا تو حضرت عثمانؓ کی خدمت میں حاضر ہوا، توقع تھی کہ خلیفہ کی طرف سے خوب آؤ بھگت ہوگی، مسلمان سر آنکھوں پر بٹھائیں گے اور کوئی منصب جلیلہ بھی مل جائے گا مگر پوری نہ ہوئی۔ اب اس نے ایک منصوبہ گانٹھا عراق اور شام میں گیا، حالات کا جائزہ لیا۔ آخر مصر میں رہائش اختیار کی اور یہاں سے سازش کا جال ہر طرف پھیلا دیا۔ اس سازش کا مقصد یہ تھا کہ حضرت عثمانؓ کو مجبور کیا جائے کہ حضرت علیؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو جائیں۔ ۳۵ھ کا واقعہ ہے کہ عبدالرحمٰن ابن عدیس البلوی کے تحت چھ سو مصری اور مالک بن حارث النخعی کی قیادت میں دو سو کوفی اور حکیم بن جبلہ العبدی کے ہمراہ ایک سو بصری بیک وقت مدینہ منورہ میں جمع ہوئے۔ یہ سب مسلح تھے۔ بظاہر یہ وفود کچھ معروضات گوش گزار کرنے کیلئے حاضر ہوئے تھے۔ گفت و شنید جو حضرت علیؓ کی معرفت ہوئی ناکامیاب رہی تو باغیوں نے خلیفہ کے مکان کو محاصرہ میں لے لیا اور خلیفہ بروز روشن دارالخلافت میں اپنے ہی مکان میں قتل کیا گیا جب باغی اپنا کام کر چکے تو حضرت علیؓ کی خلافت کا اعلان کر دیا۔ جب خبر شہادتِ عثمانؓ عرب اور شام میں شائع ہوئی تو تمام عرب بالخصوص قبائل قریش بھڑک اٹھے۔ اسی ایک واقعہ نے اموی خلافت کو ہاشمیوں کے خلاف زبردست تقویت دی۔ امیر معاویہؓ اور حضرت عثمانؓ میں قرابت قریبہ اتنی ہی تھی جو عبد مناف کے پوتوں عبدالمطلب اور امیہ میں تھی۔ حضرت علیؓ اور امیر معاویہ میں جنگ ناگزیر تھی۔ دونوں "صفین" میں صف آرا ہوئے مگر حضرت عائشہ صدیقہؓ درمیان میں آ گئیں اور صلح و صفائی تقسیم خلافت پر ہو گئی۔ جب تک دونوں حضرات زندہ رہے کوئی خاص واقعہ ناخوشگوار ظہور میں نہیں آیا۔ ظاہر ہے کہ اموی اور ہاشمی رقابت نے دو سیاسی فریق پیدا کر دیئے اور تفریق دنیائے اسلام میں سیاسیات کی وجہ سے ہوئی۔ موضوع بحث حق خلافت تھا اب دو مرکزی حکومتیں دمشق میں اموی اور کوفہ میں ہاشمی قائم ہو گئیں۔

قرآن میں (آیۂ استخلاف) مومنین سے وعدۂ خلافت اصل مقصد "تمکین دین" کے لئے ہوا یعنی خلافت ایک ذریعہ تمکین دین کا تھا جیسے جمع مال کا مقصد آرام و آسائش ہے، لیکن جمع مال کی ہوس اصل مقصد آرام و آسائش کو اسی طرح نظر انداز کرتی ہے بلکہ اصل مقصد کو ذرائع پر قربان کر دیتی ہے۔ جس طرح دنیائے اسلام مسئلہ خلافت میں ایسی الجھی کہ یہی اصل مقصد بن گیا اور ایک پختہ عقیدہ ہو گیا۔

مختار ابن ابی عبید الثقفی الملقب بہ کیسان

ابن خلکان لکھتا ہے کہ یہ شخص حضرت علیؓ کا غلام تھا، اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ شخص اس تلاش میں تھا کہ ہاشمیوں میں سے کوئی ایسی شخصیت مل جائے جس کو وہ اپنا آلۂ کار بنائے۔ نگاہ انتخاب حضرت علی بن حسینؓ زین العابدین پر پڑی مگر وہ اس کا اصل عندیہ بھانپ گئے اور پیشکش نہ صرف ٹھکرا دی

بلکہ اہل مدینہ کو فتنہ کیا کہ مختار کے قریب میں نہ آئیں۔ مختار نے عبداللہ بن زبیرؓ کی طرف رجوع کیا۔ آپ ارضِ حجاز میں اپنی حکومت قائم کر چکے تھے۔ بصرہ میں آپ کا بھائی مصعب عراق پر چھایا ہوا تھا۔ اس وقت اموی خلافت معرضِ خطر میں تھی۔ امیر معاویہؓ کے بعد یزید اور یزید کے بعد معاویہ ثانی اور معاویہ ثانی کے بعد یزید ثانی یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔ یزید ثانی بلا جبر و اکراہ خلافت کو دستبردار ہو گیا۔ میدان خالی تھا اس لئے بصرہ میں مصعبؓ اور مکہ میں عبداللہ بن زبیرؓ اور کوفہ میں مختار کھڑے ہو گئے۔ جب مصعب نے اپنے بھائی کو مختار کے ارادہ سے مطلع کیا کہ اس نے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانے کیلئے بیت المال خالی کر دیا ہے اور اپنی عجمی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے تو ابن زبیرؓ نے جواب طلب کیا۔ مختار نے جواب دیا کہ محمد ابن الحنفیہ کا خطبہ کوفہ میں پڑھا۔ محمد خولہ بنت جعفر قبیلہ حنفی کے بطن سے حضرت علیؓ کا بیٹا تھا اور یہ شاخ "علوی" کہلائی۔ مختار نے خطبہ میں وضاحت کی کہ خلافت کا حق اولاد علیؓ کا ہے، بنو فاطمہ حسنی اور حسینی تو خود ہی دست بردار ہو گئے۔ زبیرؓ کے بیٹوں کا تو کوئی حق ہی نہیں، یہ جوانمرد ابن الحنفیہ عالم دین اور زاہد و عابد اور شدید القوۃ ہے اس کی ولادت کی نسبت آنحضرتؐ نے حضرت علیؓ کو بشارت دی تھی کہ اس کا نام میرا نام اور اس کی کنیت ابو القاسم میری کنیت ہو گی، امت میں سے ہر ایک مسلمان کو اختیار ہے کہ میرا نام اپنی اولاد کا رکھ سکتا ہے مگر میری کنیت اسی ایک کیلئے جائز ہے محمد ابن الحنفیہ تو اس وقت کوفہ میں موجود نہ تھے، غائبانہ سب نے مختار کے ہاتھ پر بیعت کی۔ مصعب بصرہ سے لاؤ لشکر کے ساتھ کوفہ کی طرف بڑھا۔ پہلی ہی جھڑپ میں عجمیوں نے پیٹھ دکھائی۔ مختار مارا گیا۔

محمد بن الحنفیہ کی وفات کے بارہ میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ مدینہ میں فوت ہوا اور ابان بن عثمانؓ بن عفان نے نماز جنازہ پڑھی اور جنت البقیع میں دفن ہوا۔ بعض کہتے ہیں کہ طائف میں ابن زبیرؓ سے لڑا اور وہیں فوت ہوا، بعض کہتے ہیں کہ "ایلہ" میں رحلت کی، مگر فرقۂ مختاریہ یا کیسانیہ جس کی طرح مختار نے ڈالی تھی یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ آپ فوت نہیں ہوئے بلکہ جبل "رضوی" میں غائب ہو گئے اور کسی وقت خروج فرمائیں گے۔ جبل رضوی کے بارہ میں بھی اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں کہ مکہ و مدینہ کے درمیان بحر قلزم سے دو منزل پر واقع ہے، فرقہ مختاریہ محمد ابن الحنفیہ کو "مہدی موعود" تسلیم کرتا ہے۔ مسعودی کی کتاب "مروج الذہب" اور ابن خلکان کی کتاب "وفیات الاعیان" میں وہ اشعار جو "کثیر" سے منسوب ہیں ابن الحنفیہ کی مدح میں نقل کئے گئے ہیں۔ آخری دو اشعار تبرکاً ہم بھی نقل کرتے ہیں۔

(سن رکھو کہ امام تو قریش ہی سے ہیں مگر دو ستاروں حق چار شخص علیؓ اور آپ کے تین تن جن کا نانا پیغمبر ہے اور یہ کوئی راز کی بات نہیں، ان میں ایک صاحب ایمان و شکوہ نیکوکار اور دوسرا کربلا میں مدفون ہے)

وسبط لا تراہ العین حتی ۔۔۔ یقود الخیل یتبعہا اللواء

یغیب ولا یری فیہم زمانا ۔۔۔ برضوی عندہ عسل وماء

(اور تیسرا فوت نہ ہو گا جب تک لاؤ لشکر کے ساتھ پرچم لہراتا ہوا خروج نہ کرے۔ اس عرصہ تک رضوی میں پوشیدہ ہے اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اس کے پاس شہد اور پانی کی نہریں ہیں۔)

شامیوں نے یزید کی جگہ مروان کو تخت خلافت پر بٹھایا۔ ابن زبیرؓ مکہ میں اور مصعب کوفہ میں لڑتے ہوئے مارے گئے اور اموی حکومت

پھر سے قائم ہوگئی۔ یزید ثانی کی ایک سیاسی غلطی سے ہزاروں مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہہ گیا۔ ابن زبیرؓ کے بارہ میں بھی احادیث وضع ہوئیں جو مہدی کے ضمن میں روایت کی جاتی ہیں کہ "رکن و مقام" کے درمیان لوگوں سے بیعت لیگا۔ ایک لشکر شام سے مقابلہ کیلئے آئیگا اور بمقام "دابق" زمین میں دھنس جائے گا۔

. . . . . .

. . . . . .

. . . . . .

محمد ابن الحنیفہ علوی زمین میں غائب ہوگیا یا آسمان پر اٹھایا گیا۔ بہرحال اس کی "رجعت" یعنی آمد ثانی کا انتظار باقی رہ گیا، اب امامت نے تین صورتیں اختیار کرلیں، ایک "امام غائب" اس کا قائم مقام "امام حاضر" اور اس کی رجعت کا انتظار "امام منتظر" ان تینوں صورتوں کی تفصیل "شیعہ اثنا عشریہ" اور اسماعیلیہ "سبعیہ" کے عقائد درباره امامت میں واضح تر ہے ان عقائد میں حلول و اتحاد یعنی تناسخ اور رجعت یعنی آمد ثانی اور تشبیہ و مماثلت و بروز و ظلی کا فلسفہ وہی کچھ ہے جو عجمی مذاہب میں قدر مشترک ہے، ابن الحنیفہ کے بعد لوگوں کا رجوع اس کے بیٹے "ابی ہاشم" کی طرف ہوا۔ اس امام حاضر کی وفات (۷۸ھ) کے بعد حسب وصیت ابی ہاشم کی روح عبداللہ بن عمرو بن حرب کندی میں حلول کر گئی۔ شہرستانی اس عبداللہ کے بارہ میں لکھتا ہے کہ "وہ تناسخ کا قائل تھا، اس کا یہ دعوی تھا روح اللہ عیسیٰ دوبارہ دنیا میں تشریف فرما ہوں گے، آپ کی روح کا حلول مجھ میں ہوا اور میں مثیل مسیح بحیثیت بشر اور اللہ بلحاظ روح ہوں، ایسا ہی جیسا آدم صفی اللہ بنا کر اس میں روح اللہ کا حلول ہوا تو ملائکہ نے اس کے حضور سجدہ کیا، اس نے خورد و نوش اور حرام و حلال کا امتیاز بھی اٹھا دیا تھا اور مذہب مزدکیہ کی بہت باتیں اس کی تعلیم میں تھیں"۔

ابو مسلم خراسانی

فرقہ مختاریہ یا کیسانیہ کی بہت شاخیں ہیں لیکن سب تناسخ اور رجعت اور تشبیہ کی بنیاد پر قائم ہیں۔ اختلاف صرف بعض شخصیتوں کے دعوی امامت کے بارہ میں ہے۔ ایک فرقہ جو "رزامیہ" سے موسوم ہے کہتا ہے کہ ابی ہاشم نے وصیت علی بن عبداللہ بن عباسؓ کے حق میں کی، علی نے اپنے بیٹے محمد کے حق میں اور اس نے اپنے بیٹے ابراہیم کے حق میں کی، اس طرح روح امامت خاندان عباسیہ میں منتقل ہوگئی۔ شہرستانی ابو مسلم کی نسبت لکھتا ہے کہ

> ابو مسلم کا مذہب کیسانیہ تھا، ابتدا میں اسی مذہب پر اس کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ اس نے کوشش کی کسی طرح امام جعفر بن محمد الصادق کو اپنے دام تزویر میں پھانسے مگر جب ادھر سے ناامید ہوا تو ابو العباس بن محمد کی طرف رجوع کیا اسی کی کوشش سے بنو امیہ کا تختہ حکومت شام میں الٹ گیا اور بنو عباس کا قبضہ امامت و خلافت پر ہوگیا۔ ابو مسلم کی نسبت اس کے خراسانی جاں نثاروں کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ "مظہر الوہیت" زندہ ہے اور سیاہ جھنڈوں کے ساتھ کسی وقت خروج کریگا۔
>
> خلیفہ منصور عباسی ابو مسلم کے بلند ارادوں سے واقف تھا اسے ٹھکانے لگایا۔ مگر ابو مسلم اپنے پیچھے ایک مذہب چھوڑ گیا جو "خرمیہ" سے موسوم ہے۔

تاریخی حقیقت یہ ہے کہ "بنو فاطمہ" یعنی شیعہ اثنا عشریہ کے دوازدہ امام سیاسیات سے بالکل الگ رہے۔ بنو عباس نے اس میں حصہ لیا، ان کے داعی (PROPAGANDISTS) ایرانی عجمی تھے، وہ دنیائے اسلام کے مختلف حصوں میں ایسی احادیث بیان کرتے جن میں کسی شخصیت مہدی وغیرہ کی آمد کی پیش گوئی آنحضرتؐ سے منسوب کرتے ظاہر ہے کہ یہ روایات جواب بھی صحاح ستہ میں محفوظ ہیں سیاسی تدبر کی اختراع تھیں جن کا مضحکہ ابن خلدون اپنے مقدمہ میں اڑاتا ہے۔ صحاح ستہ کے مولف بھی عجمی یا نیم عرب ہیں جو عجمی ماحول میں پیدا ہوئے۔ لیکن حیرت ہے کہ "صحیح بخاری" میں مہدی اور اس کی آمد ثانی کے بارہ میں کوئی حدیث موجود نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لاکھوں احادیث کے طومار میں جو بخاری کے زمانہ (تیسری صدی) یا اس سے پیشتر وضع ہو چکیں احادیث دربارہ "مہدی موعود" بخاری کے معیار پر پوری نہ اتریں اسلئے مسترد کر دیں ایک مبہم سی حدیث نزولِ عیسیٰؑ کے بارہ میں ہے چونکہ "احاد" ہے اسلئے عقائد میں داخل نہیں لیکن بظاہر الحاقی ہے۔

اگر اس حد تک عجمی داعیانِ بنو ہاشم کی سرگرمی رہتی تو شاید ہمیں شکایت برسبیل حکایت ہی ہوتی۔ لیکن بنو امیہ کے زوال حکومت پر ایرانی روح بیدار ہو گئی اور بقول قاسم زادہ اسکی جلوہ ریزی آہستہ آہستہ نمایاں ہوتی گئی۔ تفسیر اور تراجم اور مغازی کے بارہ میں بیشمار احادیث جو صحاح ستہ میں محفوظ ہیں اور جن کی نسبت امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے کہ ان کی کوئی سند ہی نہیں انہی ایام میں وضع ہوئیں۔ یہ کام زندیقوں نے نہایت ہوشیاری سے سرانجام دیا۔

سلمان فارسی

اگر داعی صرف بنو ہاشم سے وابستہ رہتے تو روحِ ایران جلوہ ریز نہ ہوتی اور زنادقہ کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے اسلئے ایک شخصیت سلمان فارسی نامی احادیث کے ساتھ گھڑی گئی، یہ کوئی تاریخی شخصیت نہیں اگر ہو تو زیادہ سے زیادہ کوفہ یا بصرہ میں حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں کوئی ایرانی ہوا خواہ ہو سکتا ہے۔ مورخ ابن اثیرؒ "اسد الغابہ فی سیرۃ الصحابہ" میں سلمان کو اصحاب رسول اللہؐ میں شمار کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ اسکی عمر میں اختلاف ہے ڈھائی سو برس سے چھ سو سال بیان کی جاتی ہے اس نے حواریانِ مسیح کا زمانہ پایا، ان کی صحبت میں رہا اور اس کو مسیح کی پیش گوئی دربارہ بعثتِ احمدؐ (فارقلیط) معلوم تھی اور یہ بھی علم تھا کہ آنحضرتؐ کا ظہور "یثرب" میں ہوگا۔ چنانچہ یہ چند راہبوں کی خدمت میں رہا اور ان کی وفات کے وقت اس پیش گوئی کی تصدیق بھی انہی سے ہوتی رہی آخر یہ ایک یہودی کی غلامی میں آیا جو شام سے مال تجارت یثرب کی طرف لا رہا تھا، یہ بھی اس طرح یثرب میں آ گیا۔ اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ اب زمانہ بعثت آ گیا ہے چنانچہ مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کے بعد جب آنحضرتؐ کی رسالت کا شہرہ ہوا تو یہ بھی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوا۔ آنحضرتؐ نے مہاجرین و انصار کی مدد مالی کے ذریعہ اسکو یہودی کی غلامی سے نجات دلائی، آنحضرتؐ نے جب مہاجرین و انصار میں "مواخات" قائم کی تو سلمان دونوں میں شمار نہ ہوا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا "سلمان من اھل بیتی" یعنی سلمان میرے اہلبیت میں ہے۔ مولانا عبد الحلیم شرر کے ناول جو یاتے حق کا مواد یہی روایات ہیں۔ اہل بیت کا عجمی مفہوم یہ ہے کہ اس سے مراد پنجتن علیؓ و حسنؓ و حسینؓ و فاطمہؓ بشمول آنحضرتؐ ہیں۔ عالانکہ عربی زبان بالخصوص قرآن میں اس کا مفہوم "ازواج" ہیں اردو میں ہم گھر والی یا گھر والیاں کہتے ہیں۔ ایک حدیث دربارہ "مباہلہ" میں مذکور ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے استدعا کی کہ مجھے بھی مباہلہ میں شامل کیا جائے تو آنحضرتؐ نے فرمایا کہ نہیں اس میں صرف میرے اہل بیت میری بیٹی اور علی اور انکی اولاد شامل ہو سکتی ہے۔ مباہلہ کی دعوت نجران کے عیسائیوں کو آنحضرتؐ نے دی جو ایک وفد کی صورت میں مع اہل و عیال مدینہ میں آئے تھے بحث کا موضوع توحید اور تثلیث تھی۔ جب دلائل عقلیہ و نقلیہ فریق مخالف نے تسلیم نہ کئے تو آنحضرتؐ نے فرمایا "تعالوا ندع ابناءنا و ابناءکم ونساءنا ونساءکم وانفسنا وانفسکم ثم نبتھل فنجعل،

لعنت اللہ علی الکٰذبین (۳/۶۱) آیت کے الفاظ بالکل واضح ہیں جس طرح فریقِ مخالف کے نفوس اور ان کے بیٹے اور ازواج تھے انہی کے مقابل آنحضرتؐ اور مہاجرین و انصار کے بیٹے اور ازواج تھیں۔

سلمان فارسیؓ نے غزوہ احزاب یا خندق میں مدینہ کے گرد خندق کھودنے کا مشورہ آنحضرتؐ کو دیا تھا۔ اس فنِ حرب یا "بدعت" سے اہلِ عرب واقف نہ تھے جب آیہ "آخرین منھم لما یلحقوا بھم" (۶۲/۳) نازل ہوئی تو اصحابؓ نے آنحضرتؐ سے دریافت کیا کہ وہ کون خوش قسمت لوگ ہیں جو ہم سے ملحق ہوں گے۔ سلمان فارسی پہلو بہ پہلو ہم نشین تھا آنحضرتؐ نے اس کے زانو پر ہاتھ مار کر فرمایا کہ اس کی قوم کے لوگ ہوں گے اور ان میں ایک شخص اس عظمت و شان کا پیدا ہوگا کہ ایمان خواہ ثری میں یا ثریا میں ہوگا وہاں سے لے آئیگا۔ اور علم اولین و آخرین کا وارث ہوگا۔ اسی شانِ نزول نے "امام منتظر" کا یقینی امکان پیدا کر دیا اور اس کے ساتھ نبوت و رسالت کا دروازہ بھی کھل گیا۔ چنانچہ بہائی "آیہ یدبر الامر من السماء وفی الارض ثم یعرج الیہ فی یوم کان مقدارہ الف سنۃ مما تعدون (۳۲/۵) سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ ہر ایک رسول کا امرِ رسالت ایک ہزار سال ہوتا ہے، اس کے بعد نئے رسول اور نئی شریعت کا دورہ شروع ہوتا ہے۔ آیہ آخرین منھم الآیہ کے عدد بھی بحساب جمل ایک ہزار سے کچھ زائد ہیں۔ "خاتم النبیین" کا مفہوم یہ ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد انبیاء ایام جاہلیت کے مناسب نہ ہوئے ذہنی ارتقا کی وجہ سے "خلفا" ہوئے اور اب خلافت بھی ہزار سال بعد ختم ہو گئی۔

اس موضوع پر میرا تبادلہ خیالات امرتسر میں بہائی داعی حکیم محمود زرقانی سے ہوا۔ میں نے آیات سورۃ لیلۃ القدر اور نیز آیات انا انزلنٰہ فی لیلۃ مبارکۃ انا کنا منذرین فیھا یفرق کل امر حکیم۔ (۴۴/۳) اور سورۃ معارج کی آیات تعرج الملئکۃ والروح الیہ فی یوم کان مقدارہ خمسین الف سنۃ (۷۰/۴) کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ سورۃ قدر میں الفاظ "تنزل الملئکۃ والروح" اور من کل امر اور (۴۴/۳) میں "کل امر حکیم" اور معارج میں تعرج الملئکۃ والروح استعمال ہوئے جو اس کی پیش کردہ آیت (۳۲/۵) میں نہیں۔ اس آیت میں ایک "امر" مذکور ہے اور میری پیش کردہ آیات میں "کل امر" الفاظ ہیں جن کی تکمیل یا انتہائی عروج پچاس ہزار سال میں ہوگا اور ان میں سے ہر ایک امر "محکم" ہے۔ انکی "تصدیق" ہر ایک زمانہ میں اہل علم و حکمت کرتے رہیں گے جیسی کہ ہو رہی ہے۔

ختم نبوت

میں نے یہ بھی گزارش کی کہ آنحضرتؐ کی بعثت سے پیشتر ایام جاہلیت و ظلمات تھے اسلئے رسل اور انبیاء کا مسلسل مبعوث ہونا تکمیل دین کیلئے ناگزیر امر تھا۔ ان ایام میں دو حکومتیں دینی اور دنیوی انبیا اور ملوک کی تھیں اور بلاشبہ "نعمت" اور رحمت ہی تھیں اور قوموں نے ترقی انہی کے زیر اثر کی۔ خاتم النبیین کی بعثت پر یہ دو حکومتیں (CHURCH & STATE) رفتہ رفتہ ختم ہونے والی تھیں اور ختم ہو رہی ہیں اسلئے آنحضرتؐ نے "شوریٰ" قائم کیا (وامرھم شوریٰ بینھم) یعنی شخصی حکومت جمہور کی نمائندہ حکومت میں منتقل ہو گئی۔ "خلافت" بھی من کل امر ایک امر ہے اور اس کی تکمیل اس وقت ہوگی جب ذہن انسانی انتہائی ارتقا پر ہوگا اور ہر ایک شخص اپنے اعمال کا محاسب آپ ہوگا (اقرا کتابک کفی بنفسک الیوم علیک حسیبا۔ ۱۷/۱۴)۔ اس کے بعد "قیامت" کے بارہ میں بھی تبادلہ خیالات ہوا۔ بہائی "قیامت" اس دور کو کہتے ہیں جو نئے رسول کے قیام پر قائم ہو جاتا ہے۔ چونکہ اس پر میں نے اپنی دیگر تالیفات میں مفصل بحث کی ہے اسلئے اس مقام پر اعادہ کی ضرورت نہیں۔ شخصی حکومت اور اجتہاد ختم ہو چکا ہے اسلئے کسی کا شخصی اجتہاد قابل قبول نہیں جب تک شوریٰ تصدیق نہ کرے اور شوریٰ کے باہر کسی شخصی

اجتہاد کی اشاعت" بغاوت" ہے جو مسلمانوں میں تفرقہ اور فتنہ و شر برپا کرتی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ امت واحدہ مسلمہ میں تفرقہ اور شر انگیز فرقہ بندی اسی شخصی اجتہاد نے پیدا کی اور پیدا کر رہی ہے اور ہر ایک مدعی اجتہاد دانستہ یا نادانستہ مدعی نبوت و ملوکیت ہی ہوتا ہے۔ اور شوریٰ کے متوازی اپنی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔ ہر ایک اہل الرائے کو تفقہ فی الدین اور اجتہاد کا حق حاصل ہے مگر اسے کسی مناسب ذریعہ سے شوریٰ میں پیش ہونا چاہیے۔ "حکومت خواہ بری ہو بد نظمی سے بہتر ہے" (قول حضرت علیؓ) واجب ہے کہ انسان غلطی کرے۔ اور اسی میں اس کے ارتقا کا راز مضمر ہے۔ عقلی غلطی عقل ہی سے رفع ہوتی ہے۔ اب جو شخص مدعی نبوت و رسالت ہے وہ دراصل "مدعی الوہیت" ہے یا اپنے آپ کو نادانستہ ہمالہ سے بھی کچھ زیادہ درجہ پہ لے آتا ہے جو غلطی نہیں کرتے اور ترقی بھی نہیں کرتے اسلئے "عصمت" کا عجمی تخیل قرآن نے شرک عظیم قرار دیا ہے یہ تاریخی حقیقت ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد جس کسی نے دعویٰ نبوت یا رسالت کیا اپنے لئے شان الوہیت بھی پیدا کر لی، بہائی تو علی الاعلان بہاء اللہ کو مظہر الوہیت کہتے ہیں۔ ہمارے ایک مغل پنجابی نے بھی سلمان فارسی سے رشتہ جوڑا۔ آپ کو وحی ہوتی ہے کہ "انت ولدی" انسان کا بیٹا انسان، خدا کا بیٹا خدا ہی ہوتا ہے (نقل کفر کفر نباشد)۔

آنحضرتؐ کے بعد مدعیان نبوت و رسالت والوہیت بہت ہوئے اور سب عجمی تھے اور آئندہ جو بھی ہوں گے عجمی ہی ہوں گے۔ مثیل مسیح اور مہدی موعود بھی بہت ہوئے ہم نے ان کا تذکرہ اپنی کتاب "مذاہب اسلامیہ" میں کیا ہے اس لئے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اس مقام پر ہم صرف یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ان کا اثر مسلمانوں کے عقائد پر کیا ہوا تفصیلی تاریخی واقعات سے طول دینا نہیں چاہتے بالاختصار گذارش ہے کہ ابو مسلم کے بعد حکیم المقنع نے دعویٰ نبوت و رسالت والوہیت کیا۔ تخت خلافت پر محمد المہدی عباسی "امام" اور عم زادہ "عیسیٰ" ابن موسیٰ سپہ سالار تھا عیسیٰ کی وفات کے بعد اور بھی اس عہدہ پر متمکن ہوئے "سعید الحرشی" نے مقنع کو محاصرہ میں لیا، اس کا سر مہدی کے پاس بھیجا گیا مگر مقنع کے پیرو کہتے ہیں کہ مارا نہیں گیا روپوش ہو گیا اور کسی مناسب وقت پر "رجعت" ہو گی، محمد المہدی کے بیٹے ہادی کے عہد میں احادیث درباره رجعت وملاحم کثرت سے شائع ہو رہی تھیں۔ خلیفہ نے ایک خاص محکمہ "صاحب الزنادقہ" قائم کیا۔ کئی واضعان حدیث گرفتار ہوئے اور مارے گئے، مہدی اور ہادی اور ہارون الرشید کے عہد میں ان کی تلاش رہی اور جو زندیق حکومت کے کلیدی عہدوں پر چھائے ہوئے تھے معزول ہوئے یا مارے گئے۔ ان میں سے "برامکہ" مشہور ہیں، ایک زندیق عبد الکریم وضاع گرفتار ہوا تو کہا کہ جو چاہو سلوک کر دو کئی لاکھ احادیث وضع کر چکا ہوں جو دنیائے اسلام کے طول و عرض میں شائع ہو چکی ہیں اور تمہارے مٹائے سے مٹ نہیں سکتیں، ابن ندیم نے الفہرست میں زنادقہ کے اکابر کی فہرست بھی دی ہے جو بظاہر مسلمان کلمہ گو اور باطن میں ثانی کے چیلے تھے، ان میں سے ایک "الجعد بن درہم" کو اموی خلیفہ ہشام نے قتل کیا، ایک اور شاعر "بشار بن برد" ۱۶۷ھ میں مارا گیا۔ آٹھویں عباسی خلیفہ معتصم باللہ نے اپنے وزیر "محمد بن الزیات" کو ۲۳۳ھ میں اس کے ہوا خواہوں کے ساتھ تلوار کی گھاٹ اتارا، ایک خاص بات ان مدعیان نبوت والوہیت میں یہ تھی کہ حکومت وقت کی وفاداری کا دم بھرتے رہے بلکہ حکومت کے دشمن کا مقابلہ بھی کرتے رہے۔ عباسی حکومت کی دشمن اموی تھے جن کا پشت پناہ عرب تھا، اسلئے عرب کا زور توڑنے کے لئے عباسیوں نے وہی کام کیا جو مغلیہ شہنشاہ اکبر نے افغانوں کی طاقت کمزور کرنے کیلئے راجپوتوں کو ابھار کر سامنے کر دیا۔ عباسیوں نے عجمیوں کو عربوں کے مقابل کھڑا کر دیا۔ اس سیاسی تدبیر سے کچھ عرصہ کام تو خاطر خواہ ہوا مگر عجمی زور پکڑتے گئے اور حکومت کے مختلف شعبوں پر

چھا گئے۔ ہارون رشید کا بیٹا مامون رشید تخت نشین ہوا تو یہ پھر زور پکڑ گئے۔ مامون کی والدہ ایرانی نژاد تھی اس کے عہد میں بابک خرمی نے علم بغاوت بلند کیا۔ بابک کا دعوٰی نبوت والوہیت تھا۔ عجمی طاقت کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ عباسی فوجی افسران یحیٰی ابن معدا ور عیسٰی ابن محمد اور محمد ابن حمید طوسی وغیرہ نے اس کے مقابلہ میں پے درپے شکست کھائی۔ آخر افشین کی سپاہیانہ چال کا شکار ہوا۔ طبری اور مسعودی لکھتے ہیں کہ اس نے کم از کم تین لاکھ مسلمانوں کو تلوار کی گھاٹ اتار دیا۔

افشین افشین جس نے بابک کی بغاوت فرو کی حسب روایت بیہقی "شاہان ایران کی نسل سے تھا۔ اس وقت خلافت عباسیہ کی طرف سے عبد اللہ بن طاہر خراسان کا والی تھا اس کی ولایت میں "مازیار" نے طبرستان سے خروج کیا۔ اور افشین نے اس کی خفیہ مدد کی۔ طبری لکھتا ہے کہ یہ بھی در پردہ زندیق ہی تھا۔ "مازیار" سغد کا شہزادہ اور موبد بھی تھا جب مازیار اور افشین گرفتار ہو کر ابن الزیات کی عدالت میں پیش ہوئے تو دو گواہوں نے افشین کے خلاف شہادت دی۔ ان دونوں کے جسم پر بید کی ضربات کے نشان تھے جو افشین کے حکم سے لگائے گئے تھے۔ نشان ابھی تازہ ہی تھے۔ ان میں سے ایک امام مسجد اور دوسرا موذن تھا۔ افشین نے اپنی صفائی میں یہ واقعہ بیان کیا کہ میں نے مازیار سے عہد و پیمان کیا تھا کہ وہ اور اس کی رعایا کے لوگ آزادانہ اپنی مذہبی رسوم ادا کر سکتے ہیں اور کوئی مسلمان مداخلت نہیں کریگا لیکن ان دونوں نے ایک منصوبے کے تحت ان کے ایک مندر پر حملہ کر دیا اور اس کو مسجد میں تبدیل کر دیا۔ اقلیت اور "ذمیوں" کی حفاظت حکومت کا فرض ہے۔ میں نے ان کو مناسب سزا دی۔ یہ عذر معقول اور کافی بریت کیلئے تھا لیکن خانہ تلاشی کے وقت افشین کے قبضے سے ایک مطلا کتاب "زروا" بھی برآمد ہوئی تھی۔ اس میں ایرانی حکماء زرتشت مانی و مزدک کے اقوال لکھے ہوئے تھے۔ افشین نے جواب دیا کہ بلاشبہ اس میں کچھ کفر و شرک کی باتیں بھی ہیں لیکن میں ان کو نظر انداز کرتا ہوں۔ یہ کتاب مجھے وراثت میں ملی۔ زرو جواہرات سے میں نے مزین نہیں کی۔ یہ ایسی ہی ایک کتاب ہے جیسی "کلیلہ دمنہ" اور عام مسلمان پڑھتے ہیں۔ یہ عذر بھی معقول ثابت ہوا۔ چند اور گواہوں کے بعد "مازیار" پیش ہوا۔ بیان میں کہا کہ افشین کی خط و کتابت میرے بھائی "کہیار" سے تھی۔ اس نے میرے بھائی کو اپنے ایک خط میں حکومت کے خلاف ایک منصوبہ میں شریک ہونے کی ترغیب دی اور لکھا کہ ان عربوں کو نیچا دکھانا بہت سہل ہے۔ اگر تو علم بغاوت بلند کرے تو عباسی افسران فوج میں کوئی ایسا نہیں جو میرے سوا تیرے مقابلہ میں بھیجا جائے۔ میرے ہمراہ میری ہی دلاور سپاہ ہو گی جو مجھ سے ملحق ہو جائے گی۔ عباسی فوج میں عرب اور افریقی اور ترک ہیں۔ عرب تو پیٹ کے بھوکے ہیں اور افریقی مکھیاں تعداد میں تھوڑی ہی ہیں تیرے تیر اندازوں کے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکتے۔ جب ترکوں کے ترکش تیروں سے خالی ہو جائیں گے تو ہمارے سواران کو آسانی سے تہ تیغ کر دیں گے۔ افشین نے یہ شہادت بھی تسلیم کی اور جواب میں کہا کہ مجھے معلوم تھا کہ کہیار بغاوت پر آمادہ ہے میں اسے حکمت سے گرفتار کرنا چاہتا تھا جیسے اس سے پہلے بابک خرمی کو کیا تھا۔ افشین نے باوجود قبول اسلام ختنہ نہیں کرایا تھا اس کا جواب یہ دیا کہ صحت کا خطرہ تھا۔ عدالت نے یہ کہا کہ میدان جنگ میں شمشیر و سنان سے بڑھکر خطرہ نہیں ہو سکتا۔ افشین سیاسی آدمی تو تھا مگر حقیقت اسلام سے واقف نہ تھا۔ اموی خلیفہ عمر بن عبد العزیزؒ کے لفظوں میں جواب دیسکتا تھا جو آپ نے مصر کے والی کو اس کے استفسار پر دیا تھا کہ مصری جوق در جوق اسلام قبول کر رہے ہیں غالباً جزیہ سے بچنا چاہتے ہیں، کیا میں ان کا امتحان ختنہ سے کروں؟ آپ نے لکھا کہ بعثت رسول کریم لوگوں سے جزیہ وصول کرنے اور مختون بنانے کیلئے مبعوث

نہیں ہوئے تھے۔ اگر تونے لوگوں کو اسلام سے باندھنے کیلئے کوئی ایسی حرکت کی تو میں ایک غلام بھیجوں گا جو تیرے حواس خمسہ درست کر دیگا تمام واقعات اور حالات پر غور کرنے کے بعد عدالت نے افشین کو زندیق قرار دیا اور معتصم باللہ کے عہد میں قتل ہوا۔

سید

امام جعفر بن محمد الصادق کی وفات کے بعد شیعیانِ علی دو فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔ امامیہ اثنا عشریہ آپ کے بیٹے موسیٰ کاظم کو امام جانشین تسلیم کرتے ہیں اور اسماعیلیہ "سبعیہ" آپ کے بڑے بیٹے اسمٰعیل کو امام برحق مانتے ہیں۔ اثنا عشریہ کہتے ہیں کہ اسمٰعیل باپ کی زندگی میں فوت ہو گیا تھا اور اس کی سیاسی سرگرمی اور دیگر وجوہ پر امام صاحب نے اسے عاق کر دیا تھا اور یہ کہ اسمٰعیلی دعویدار دراصل اسمٰعیل کی اولاد نہیں بلکہ ایک شخص عبداللہ میمون قداح کی نسل ہیں۔

امام جعفر محمد صادق کا ایک شاگرد ابوالخطاب محمد بن ابی زینب اسدی اجدع تھا۔ اکثر شیعہ فرقے اسی سے منسوب ہیں۔ خطاب اسمٰعیل کے بعد آپ کے بیٹے محمد کے حق میں تھا امام صاحب نے اسے دھتکار دیا۔ اسماعیل ۱۴۵ھ میں فوت یا روپوش ہوا۔ اور ابوالخطاب ۱۳۸ھ/۷۵۵ء میں مارا گیا۔ امام جعفر صادق ۱۴۸ھ میں فوت ہوئے۔ ظاہر ہے کہ تمام واقعات امام صاحب کی زندگی میں رونما ہوئے۔ اسماعیلیہ تسلیم کرتے ہیں کہ امام موسیٰ کاظم کی جانشینی اسمٰعیل نے بھی بحالت روپوشی تسلیم کر لی تھی۔

ابوالخطاب نے ایک نئے فرقے کی بنیاد ڈالی جو خطابیہ سے موسوم ہے۔ اس کا ایک شاگرد میمون المعروف بہ قداح تھا۔ اس نے محمد بن اسمٰعیل کو گانٹھ لیا اور طبرستان کی طرف دونوں چلے گئے۔ قداح نے حسب و نسب میں ایک نیا شاخسانہ نکالا اور یہ پختہ عقیدہ تمام فرقہ خطابیہ اور اس کی شاخوں کا ہے کہ بیٹا حقیقی روحانی ہے نہ کہ جسمانی جو ایک مرد اور عورت کے تعلق زن و شوی سے پیدا ہوتا ہے لیکن معلم جو شاگرد کی تعلیم و تربیت روحانی کرتا ہے حقیقی باپ ہے چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے یہی کہا کہ فمن تبعنی فانہ منی (۱۴/۳۶) جو بھی ابراہیم کا اتباع کریگا ابراہیم کا بیٹا ہے۔ حضرت نوحؑ کا بیٹا غیر صالح تھا اس لئے لیس من اھلک (۱۱/۴۶) نصیر الدین طوسی اسماعیلی لکھتا ہے کہ امام کی اولاد چار قسم کی ہے ایک روحانی "در معنی" جیسے سلمان فارسی، دوسرے جسمانی یا "در شکل و صورت" تیسرے دونوں روحانی اور جسمانی جیسے حسنؓ۔ چوتھے جسمانی اور روحانی یا "در حقیقت" جیسے امام حسینؓ۔ ناصر خسرو علوی اسماعیلی اپنے "سفرنامہ" میں لکھتا ہے کہ "بحرین" میں تمام قرامطہ اپنے آپ کو "سید" اور رشتہ میں بنو فاطمہ کہتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ بنو فاطمہ عرب میں امام اور شریف اور بلخ و بخارا اور افغانستان میں "سید" کہلائے۔ "سید" بنو فاطمہ اسماعیلیہ نے اپنے داعیوں کو خطاب کیا تھا۔

قرامطہ

"الاحسا" سے ایک شخص قرمطی سلیمان بن الحسن داعی بنو فاطمہ اسماعیلیہ نے سن ۳۰۰ھ کے قریب خروج کیا۔ شہرستانی لکھتا ہے کہ فرقہ باطنیہ اسماعیلیہ کے بہت لقب ہیں۔ عراق میں ان کو باطنیہ، اور قرامطہ اور مزدکیہ اور خراسان میں تعلیمیہ اور ملاحدہ (صوفیہ کرام) کہتے ہیں۔ قرامطہ کا زور بحرین میں بہت تھا۔ یمن پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا، عراق میں عرصہ تک قتل و غارت کا بازار گرم رکھا۔ عباسی خلفا المکتفی اور المقتدر بے بس تھے۔ تقریب حج پر مکہ معظمہ پر دھاوا بول دیا۔ ہزاروں حاجی مارے گئے۔ حجر اسود اکھاڑ کر لے گئے اور حجاج کا راستہ تین سال تک بند رکھا۔ فاطمی خلیفہ مصر کو اطلاع ہوئی تو سخت برافروختہ ہوا اور لکھا کہ تم لوگوں کی چیرہ دستیوں نے ہمیں بدنام کیا۔ قرامطہ نے حجر اسود قاضی نیشاپور کے حوالہ کر دیا اور قاضی صاحب مکہ میں لائے اور پھر سے کعبہ میں نصب کر دیا۔

خوارزم (خیوا) اور غزنی میں بھی قرامطہ یا باطنیہ کا کچھ عرصہ طوطی بولتا رہا۔ ملتان واقع پنجاب ان کا گڑھ تھا۔ یہاں ابوالفتح قرمطی حکمران تھا۔ سلطان محمود غزنوی نے اسی کی سرکوبی کیلئے یہاں حملہ کیا۔ بیشمار قرمطی خاک وخون میں ملائے۔ ابوالفتح گرفتار ہوکر قلعہ غزنی میں قید وبند کی سختی میں مرگیا جو باقی بچے وہ بھاگ کر کشمیر اور موجودہ کافرستان تک بھاگ کر گئے۔ سلطان نے مملکت کے طول وعرض میں اعلان کردیا تھا کہ جہاں قرمطی ملے مارا جائے۔ پنجاب میں مختلف مقامات پر ان لوگوں نے خانقاہیں تعمیر کرلیں اور یہاں درویشانہ یا صوفیانہ لباس میں لوگوں کو فیوض "باطنی" سے مالامال کردیا۔ ملتان میں آج بھی اس فرقہ کے لوگ جو زیادہ تر ہندو ہیں "شمسی" کہلاتے ہیں۔ یہاں ایک قرمطی بزرگ شمس سبزواری کا مزار ہے اور غلطی سے لوگ شمس تبریز کا مقبرہ سمجھتے ہیں۔

ایک اور داعی حسن بن صباح اور اس کے فدائیوں نے دنیائے اسلام میں جو دہشت پھیلائی تاریخ میں بہت مشہور ہے اس لئے اشارہ ہی کافی ہے کہ یہ لوگ "حشاشین" سے موسوم ہیں "حشیش" (بھنگ) کا کرشمہ حسن نے وادی سندھ میں دیکھا تھا۔ یہاں ہندو سادھو اس کے رسیا تھے، یہ تحفہ برگ سبز جس فدائی کو نصیب ہوا "فلک سیر" کرتا رہا۔ حسن نے ایک کتاب "فصول چہارگانہ" لکھی، امام فخرالدین رازی نے تنقیدی تردید کی، اصل کتاب تو نہیں ملتی مگر امام صاحب کا شکرگذار ہونا چاہئے کہ اقتباسات شرح وبسط کے ساتھ محفوظ کردیئے۔ سید امیر علی اپنی تاریخ (HISTORY OF SARACENCE) میں لکھتا ہے کہ فرقہ اسماعیلیہ باطنیہ کے عقائد زرتشتی، مانوی اور مزدکی سے بہت ملتے جلتے ہیں۔

دنیائے اسلام میں ان باطنی صوفیوں کا وہی کچھ احترام تھا جو ہندوستان میں سنیاسیوں اور عیسائیوں میں رہبان کا ہے۔ ان کی جھونپڑیاں اور "مونسٹریز" اور خانقاہیں یا زاویے گوشۂ خلوت بھی مقدس مقامات ہیں جہاں زائرین بصد عقیدت حاضر ہوتے ہیں، اگر آج مسلمان اپنے عقائد کا جائزہ ان تواریخی شواہد کی روشنی میں لیں تو ان پر واضح ہوجائے گا کہ وہ قرآن اور اسلام سے بہت دور ہیں۔ اور زرتشتی اور مانوی اور مزدکی مذاہب کے اقرب ہیں۔

حسین بن منصور حلاج

ہم ایک اور صوفی قرمطی بزرگ حسین بن المنصور حلاج کے حالات پر ان تاریخی واقعات کو ختم کرتے ہیں اس کی نسبت شیخ عطار اور خواجہ حافظ جیسے اکابر کی یہ رائے ہے کہ "جوش آں بود کہ راز افشا می کرد۔" راز کی بات کیا ہے وہی فرقہ باطنیہ اسماعیلیہ یا مانی کی تعلیم کہ "شکلِ انسان میں خدا تھا مجھے معلوم نہ تھا۔" قرمطی اتنا زور پکڑ چکے تھے کہ گوشۂ تقیہ سے بالکل سربازار آگئے۔ ان میں سے ایک حلاج بھی تھا۔ یہ علانیہ "انا الحق" کا نعرہ لگاتا رہا۔ اتنی بات پر شاید حکومت وقت بھی تعرض نہ کرتی مگر قرمطیوں کی شورہ سری کھلی بغاوت تھی۔

ابن ندیم الفہرست میں لکھتا ہے کہ یہ شخص ایرانی نژاد تھا، اگرچہ ہر ایک علم وحکمت کی ڈینگ مارتا مگر کسی میں بہرہ نہ تھا۔ اپنے آپ کو صوفی کہتا مگر تصوف سے بھی واقف نہ تھا۔ البتہ چرب زبانی اور لفاظی میں مہارت تھی۔ اس کے مرید بہت تھے۔ سلطنت کے نظام میں دخل دینا شروع کردیا۔ مدعی الوہیت تھا۔ یہ عہد عباسی خلیفہ المقتدر کا تھا۔ طبری لکھتا ہے کہ جب گرفتار ہوکر خلیفہ کے وزیر ابوالحسن علی بن عیسیٰ کے روبرو آیا تو اس نے دیکھا کہ قرآن وحدیث سے تو بیگانہ ہی ہے عربی علم ادب سے بھی آشنا نہیں۔ اس نے اسے مخلصانہ مشورہ دیا کہ بہتر ہے کہ تم کچھ عرصہ ان علوم میں دستگاہ حاصل کرو اور کسی مدرسہ میں داخل ہوجاؤ، یہ تک بندی جو تم کررہے ہو ہر ایک جاہل کرسکتا ہے

اور جہلا ہی میں فروغ حاصل کرسکتا ہے۔

ابتدا میں حلاج شیعہ امامیہ کے آٹھویں امام علی الرضاؓ کا داعی بنا۔ گرفتار ہوا تو کوفہ میں درّے لگے، جان بچی لاکھوں پائے۔ "فہرست" میں اسکی تصانیف چالیس لکھی ہیں۔ ان میں یہ فقرات بھی ہیں کہ "میں نے ہی نوح کا طوفان برپا کیا، امت نوح کو غرق کیا۔ عاد و ثمود کو ہلاک کیا۔"

"عریب" نے تاریخ طبری کو اپنے زمانہ تک مکمل کیا ہے، وہ کہتا ہے کہ حلاج شعبدہ باز تھا شیعوں میں شیعہ سنیوں میں سنی، معتزلہ میں معتزلہ غرض ہر ایک رنگ کا لباس اوڑھ لیتا۔ اپنے مریدان با اخلاص میں سے کسی کو کہتا کہ تو نوح ہے، کسی کو موسیٰ اور کسی کو عیسیٰ اور کسی کو آنحضرتؐ کا "مثیل" بناتا اور یہ مسخرے بھی نعرہ لگاتے کہ "منم محمد احمد کہ مصطفےٰ باشد" کہتا کہ تم سب ان حضرات کے "بروز" ہو، میں نے تم میں ان حضرات کی ارواح کو داخل کر دیا۔ اس کا اپنا دعویٰ "الوہیت" تھا۔ مورخ "الصولی" جو خود بھی "جرجان" کا ایک "مغ" تھا مگر اسلام قبول کر چکا تھا لکھتا ہے کہ میں کئی دفعہ حلاج سے ملا اور ہر بار مجھے معلوم ہوا کہ جاہل باتونی ہے اور صوف کے لباس میں اپنے تقدس کا مظاہرہ کرتا ہے۔

حلاج جو کچھ تھا وہ تو ان مورخین کی تحریر سے واضح ہو سکتا ہے مگر خوش اعتقاد لوگوں نے اس کا نام اتنا اچھالا کہ آپ "مثیل مسیح" تھے، مردے زندہ کرتے۔ وہ معجزات جو انبیاء سے موسوم ہیں آپ کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا۔ آپ کے خاص الخاص مرید درجۂ نبوت پر فائز تھے جو نوحؑ سے آنحضرتؐ تک دنیا کو ملا۔ اور آپ کی شان کا کیا کہنا مجسم خدا تھے۔ وزیر حامد نے سنا تو خیال کیا کہ ہو سکتا ہے کہ یہ بھی کوئی مقربان بارگاہ الٰہی سے ہو۔ لیکن علم وفضل کی لاف زنی جہلا میں تو کام کرتی ہے اہل علم و حکمت پر پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ جب وزیر مذکور نے امتحان لیا تو آپ کورے ہی نکلے۔ یہی مناسب سمجھا گیا کہ چند روز قید و بند کی سختی حواس خمسہ درست کر دے گی۔ مریدان باصفا نے بے پر کی اڑانا شروع کی کہ بعض اوقات آپ اپنے جسم اقدس کو اتنا پھیلا دیتے کہ قید خانہ میں بھی نہ سما سکتا۔ آخری دفعہ یہ "سوس" میں گرفتار ہو کر بغداد میں لایا گیا۔ اونٹ پر سوار تھا۔ نقیب آگے آگے بلند آواز کہتا جاتا کہ "اچھی طرح دیکھ لو یہ قرمطی داعی ہے۔" آخر دجلہ کے کنارہ پر ۳۰۹ھ / ۹۲۲ء میں صلیب پر آویزاں کیا گیا۔

ان واقعات سے اتنا تو واضح ہو گیا ہو گا کہ جب "زندیق" حکومت کے ہر ایک شعبہ پر چھائے ہوئے تھے یہانتک کہ قلمدان وزارت بھی ان کے قبضہ میں تھا اور آخر خلافت عباسیہ کو اپنی سرپرستی میں لے لیا تو عوام کا رجوع ان کی طرف ہوتا ہی تھا اس کے ساتھ صوفیانہ لباس میں عامۃ المسلمین کو اپنے دام تزویر میں لا رہے تھے تو عوام کے عقائد کی صورت کس حد تک مسخ ہو کر رہ گئی۔ یہ سلسلہ مدعیان الوہیت و نبوت و رسالت ان پر ختم نہیں ہوا۔ ہر ایک زمانہ میں بلکہ ہمارے زمانہ میں بھی ایسے مدعیان بہت پیدا ہوئے اور غالباً ہوں گے اور ضعیف الاعتقاد لوگوں کا ہجوم ان کے گرد پروانہ وار ہو گیا۔ ان کے دعاوی کی بنیاد وہی موضوعات کا طومار ہے جس کی نسبت امام احمد بن حنبلؒ کا ارشاد ہے کہ ان کی کوئی سند ہی نہیں۔

مثلہ معہ "زنادقہ" کی انتہائی کوشش اس منصوبہ پر مرکوز رہی کہ کسی طرح "قرآن عظیم" کی آیات میں ان کی موضوعات داخل ہو جائیں مگر یہ لاکھوں حفاظ کے سینوں میں محفوظ چلا آرہا تھا اسلئے کامیابی نہ ہوئی احادیث ایسی وضع کیں جو صحیح بخاری و مسلم وغیرہ میں بھی محفوظ ہیں کہ قرآن کا کچھ حصہ ضائع ہو گیا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ جیسے عظیم المرتبت اصحاب سے

طویل روایات ہیں کہ خلیفۂ ثانی نے ایک خطبہ میں کہا کہ آیۂ "رجم" قرآن میں تھی ہم تلاوت کرتے رہے اور "رجم" زانی بھی کرتے رہے اگر تم یہ نہ کہو کہ عمر نے اپنی طرف سے قرآن میں یہ آیات ملا دی ہیں تو میں ضرور لکھ دیتا، ابن مسعودؓ ایک مجمع کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قرآن ہمیشہ تلاوت کرتے رہو تاکہ تمہیں یاد ہو جائے، کبھی ہمیں بھی حفظ تھا اب دو سورتیں جو "براۃ" کے برابر طویل تھیں بھول گیا۔ صرف دو آیات یاد رہ گئیں چنانچہ آپ نے دو آیات جو مسلم میں روایت کی گئی ہیں پڑھیں۔ یہ دو آیات بھی قرآن میں موجود نہیں۔ اگر "صحیحین" پر اعتبار کیا جائے تو نتیجہ واضح ہے کہ قرآن محفوظ کتاب نہیں ہے۔ یہ اختیار اب مسلمانوں کا ہے کہ قرآن کے اس دعوے کو تسلیم کریں کہ "انا لہ لحافظون" یا بخاری اور مسلم کی روایت پر ایمان لائیں، چونکہ ایک خاص فرقہ کی یہ کوشش ہمیشہ رہی ہے کہ احادیث خواہ بظاہر قرآن کے خلاف ہوں ان میں اور قرآن میں کسی طرح مطابقت پیدا کرنی چاہیے اس لئے اتنا کہہ کر دلوں کو محض تسلی دیتے ہیں کہ یہ آیات رجم اور دو سورتیں وحی تو ہوئیں مگر منسوخ التلاوت ہیں۔ یہ "ناسخ و منسوخ" کا خطرناک حربہ بھی زنادقہ کی اختراع ہے۔ اور غرض یہی تھی کہ قرآن کا استقلال باقی نہ رہے۔

زنادقہ نے دور اندیشی سے اتنا تو سمجھ لیا تھا کہ قرآن ہر ایک شیطان رجیم کی دسترس سے بلند تر ہے۔ لیکن اتنا ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی توجہ اس سے ہٹا کر اپنی موضوعات کی طرف لگائی جائے۔ اس میں ان کو کامیابی خاطر خواہ ہوئی اور قرآن "مہجور" ہو کر رہ گیا (۱۹) یہ موضوعات آیات قرآنی کی تفسیر اور پیش گوئی پر زیادہ مشتمل ہیں اور صحاح ستہ میں محفوظ ہیں۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ خود "احسن تفسیر" ہے، اس کی آیات بینات مفصل بیان ہیں، اس کے اول مخاطب کفار مکہ امی تھے وہ تو اس کے مطالب خوب سمجھتے مگر اصحاب جو اہل زبان اور آنحضرتؐ کی صحبت کے فیض یافتہ بھی تھے ان کو تفسیر کی ضرورت محسوس ہوئی اس میں کچھ شک نہیں کہ آنحضرتؐ قرآنی آیات کے علاوہ اصحاب سے اسی طرح گفتگو بھی فرماتے تھے جیسے ہم کیا کرتے ہیں اور موضوع مختلف مسائل بھی تھے، ان میں خاص ملکی مصالحت وغیرہ کے بارہ میں "شوریٰ" میں گفتگو بھی ہوتی۔ یہ سب تقاضائے وقتی حالات وقتی باتیں تھیں، لیکن ان کو بھی "مثلہ معہ" مستقل سمجھا گیا۔ حالانکہ یہ حدیث بھی تواتر کے ساتھ بیان ہو رہی تھی کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ کوئی بات جو قرآن کے سوا مجھ سے منسوب ہو قلمبند نہ کی جائے دو سو سال یا کم و بیش اس پر عمل رہا پھر کیا ضرورت پیش آئی کہ احادیث کا طومار قلمبند کیا گیا اور عجمیوں یا نیم عرب لوگوں نے کیا۔ یاد رہے کہ اہل عرب ان کو بھی عجمی ہی کہتے جو چند پشت سے عجم میں آباد ہو چکے تھے خواہ صلبی عرب ہی تھی۔ "مثلہ معہ" اس لئے اختراع ہوئی اور اس کو شہرت اسی لئے دی گئی کہ قرآن کا ہر ایک دعویٰ غلط ثابت کیا جائے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ کفار کہتے ہیں کہ یہ قرآن آنحضرتؐ کے دل کی بنائی ہوئی باتیں ہیں۔ اگر یہ انسانی کلام ہے تو انسان بنا سکتا ہے اگر ایک نہیں تو ایک جماعت اہل علم و حکمت مل کر بنا سکتی ہے اس لئے تم بھی ایسی ہی "مفتریات" بنا کر دکھاؤ۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس کی "مثل" دنیا جہان کے جن و انس بھی کسی زمانہ میں مل کر نہیں بنا سکتے۔ اس کا جواب کفار سے تو آج تک نہ بن سکا مگر خود مسلمانوں نے مرتب کر لیا اور "احادیث" کو "مثلہ معہ" کہہ کر پیش کیا، قرآن کا دعویٰ ہے کہ اگر یہ اللہ کے سوا کسی غیر اللہ کا کلام ہوتا تو اس میں "اختلافاً کثیراً" ہوتا۔ ظاہر ہے کہ انسانی کلام میں اختلاف کثیر ہو اور یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اختلاف کثیر حکما و علماء

کلام میں بھی ہے، خلف سلف سے اختلاف کرتا ہے۔ واجب ہے کہ انسان عقلاً غلطی بھی کرے اور اسی میں اس کے ذہنی ارتقا کا راز مضمر ہے، اس ناقابلِ انکار حقیقت کا جواب یہ دیا گیا کہ "وحی" میں غلطی کا امکان نہیں (لاریب فیہ ہم بھی تسلیم کرتے ہیں) "احادیث" بھی وحی ہیں، قرآنی وحی "متلو" یا جلی، اور احادیث "غیر متلو" یا خفی۔ وحی خفی میں صرف معانی مجردہ القا ہوتے ہیں۔ الفاظ صاحبِ وحی کے اپنے ہیں۔ نفسیات کا ایک طالب علم بھی اتنی بات جانتا ہے کہ کوئی خیال دل میں بلا الفاظ پیدا ہی نہیں ہو سکتا اور یہ کہ حقائق مجردہ کا احساس انسان کیلئے ناممکن ہے (ماکان لبشران یکلمہ اللہ) "وحی" بلفظ ارادہ بھی "علی لسان قومہ" ہی ممکن ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ صاحب وحی پنجابی یا ایرانی ہو اور وحی عربی یا انگریزی اور بعض اوقات ایسے الفاظ میں ہو جس کو وہ خود بھی نہ سمجھے اور محض مجذوب کی بڑ ہو۔ یاد رہے کہ مسئلہ منہ کی تفسیر کی بھی ضرورت ہے اور یہ کام "مجدد" اور "محدث" کا ہوتا ہے، یہ "اصطلاحات" بھی زنادقہ کی اختراع ہیں۔ جو حضرات دعوی نبوت دبی زبان سے کرتے رہے وہ کم از کم مجدد اور محدث تسلیم کئے گئے۔ ایک کہتا ہے کہ "مجدد" نبی تو نہیں مگر نبی کے اقرب ہوتا ہے" دوسرا کہتا ہے کہ "نبی کا مزاج شناس ہوتا ہے"۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ احادیث صحیح بھی ہیں، موضوع بھی، ضعیف بھی ہیں، مرسل اور مرفوع بھی ہیں، مجدد جس کو صحیح کہدے وہ صحیح خواہ سلف ائمہ احادیث اس کو موضوع یا ضعیف قرار دے چکے ہوں ان میں ایک بھی نہ نبی کے اقرب تھا اور نہ نبی کا مزاج شناس، یہ اور بات ہے کہ ان کا زمانہ نبی کے اقرب تھا مگر وہ اتنے ہی دور تھے جتنے ہمارے زمانے کے "مجدد" مکان اور زمان کے لحاظ سے ہیں۔

"حقیقتِ وحی" پر ہمارے زمانہ کے ایک "مجدد اعظم" کے افکار عالیہ بھی ملاحظہ ہوں، عبارت تو طویل ہے اقتباسات فہم و تفہیم کے لئے کافی ہیں۔

"یہ بات خدا تعالیٰ کے قانون قدرت کے خلاف ہے کہ وہ شیاطین کو ان کے مواضع مناسبہ سے معطل کر دے" ارشاد قرآن ہے کہ وما ارسلنا من رسول ولا نبی الا اذا تمنی القی الشیطن فی امنیتہ (الآیہ) اس حوالہ میں ارسلنا کے بعد من قبلك کے الفاظ حذف کئے گئے ہیں، حافظہ کا قصور ہی سمجھیں۔ "جب شیطان اس میں بھی دخل دیتا ہے تو وحی متلو جو شوکت الوہیت اور روشنی تام رکھتی ہے اس دخل کو اٹھا دیتی ہے۔ . . . . یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نبی کے دل میں جو خیالات اٹھتے ہیں اور جو خواطر اس کے نفس میں پیدا ہوتے ہیں درحقیقت وہ تمام وحی ہوتے ہیں جیسا کہ قرآن کریم اس پر شاہد ہے کہ وما ینطق عن الھوٰی ان ھو الا وحی یوحی، قرآن کی وحی دوسری وحی سے ۔ جو صرف معانی منجانب اللہ ہوتے ہیں تمیز کلی رکھتی ہے اور نبی کے اقوال وحی غیر متلو ہوتے ہیں۔ . . . . تمام احادیث اسی درجہ کی وحی میں داخل ہیں جن کو غیر متلو وحی کہتے ہیں۔ . . . . اس ادنی درجہ کی وحی میں جو حدیث کہلاتی ہے بعض صورتوں میں شیطان کا دخل بھی ہو جاتا ہے . . . . اور نبی کی اجتہادی غلطی بھی درحقیقت وحی کی غلطی ہے کیونکہ نبی تو کسی حالت میں وحی سے خالی نہیں ہوتا وہ اپنے نفس سے کھویا جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ایک آلہ کی طرح ہوتا ہے . . . . اس لئے جب اس کے اجتہاد میں غلطی ہوگی تو وحی کی غلطی کہلائیگی نہ کہ اجتہاد کی غلطی . . . . تب فی الفور وحی اکبر جو کلام الٰہی اور وحی متلو اور مہیمن ہے نبی کو اس غلطی پر متنبہ کر دیتی ہے[1] . . . . وحی متلو اس دخل کو اٹھا دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کے

[1] میرزا صاحب کی طرح مودودی صاحب کا بھی یہی عقیدہ ہے۔ ملاحظہ ہو تفہیمات (حصہ اول) صفحہ ۳۶

بعض اجتہادات میں غلطی بھی ہوگئی جو بعد میں رفع کی گئی۔ (آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۲۹۰، ۲۹۱)

اس اقتباس پر حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں لیکن بعض فقرات ذرا ثقیل واقع ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر نبی کے اجتہاد کی غلطی وحی کی غلطی ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی غلطی ہوگی، غلطی اور اسکی ذمہ داری اللہ پر عائد ہوتی ہے۔ جب اس خیال نے چٹکی لی تو آپ نے یہ شبہ یہ کہہ کر دفع کر دیا کہ وحی متلو پر شیطانی دخل فوراً اٹھا دیتی ہے، اسلئے ضرور ہے کہ انبیاء اپنی غلطی پر متنبہ بھی ہوتے اور اس کا ازالہ بھی کرتے مگر اسفار موسیٰ اور انجیل میں ایسی تنبیہیں مذکور ہیں اور اب تک محفوظ بھی ہیں کہ "اسرائیل خدا کا بیٹا بلکہ پلوٹھا ہے" البتہ قرآنی محکمات نے یہ تنبیہیں محو کر دیں، بیشمار احادیث صحاح ستہ میں موجود ہیں جو قرآن کی وحی متلو کے صریحاً خلاف ہیں۔ وحی اکبر نے صرف انکا ازالہ ہی نہ کیا بلکہ خود اس ادنیٰ درجہ کی وحی کے تابع ہو کر رہ گئیں، لاکھوں احادیث سے بخاری کو چھان بین کی زحمت اٹھانی پڑی، اگر مصنف کا مفروضہ صحیح ہوتا تو ایسی احادیث شائع ہی نہ ہوتیں۔ دو دو سو سال روایت ہوتی رہیں، قلم بند ہوئیں اور اب محفوظ بھی ہیں، یہ انتہائی جسارت ہے کہ انبیاء و رسل جو بشر ہی تھے انکی "عصمت" اس حد تک تسلیم کرنا کہ ان کی اجتہادی غلطی وحی کی غلطی ہے۔ وہ معصوم عن الخطا تھے مگر اللہ تعالیٰ معصوم عن الخطا نہیں ہے۔ یاد رہے کہ نطق وحی صرف قرآن حکیم ہے لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید (۴۱/۴۲) وحی غیر متلو یا خفی ایک بے معنی اصطلاح زنادقہ نے گھڑی اور آج ایک فرقہ کا اس پر کامل ایمان ہے، اور مثلہ معہ کی رٹ لگا رہے ہیں، الحق،

فبای حدیث بعد اللہ وآیتہ یومنون، ویل لکل افاک اثیم (۴۵/۶)

آخر میں ہم یہ حقیقت واشگاف لفظوں میں کہنا چاہتے ہیں کہ جسے آج لوگ "شریعت اسلامی" کہتے ہیں اور جس کی بنیاد زیادہ تر احادیث ہیں کوئی مستقل قانون نہیں، قانون کا ہر ایک لفظ محفوظ ہونا چاہئے اور احادیث باللفظ روایت نہیں ہوئیں۔ جامع و مانع کتاب اصول احکام قرآن حکیم ہے اور دائمی ہے۔ باقی "شوریٰ" کا تفقہ فی الدین ہے جو اپنے زمانہ کے ذہنی اور خارجی حالات کے مناسب احکام وقتی وضع کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ یہ ہمیشہ ترمیم و تنسیخ ہوں گے، تفقہ اصول کے مطابق ہی تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

کسی آئندہ صحبت میں عقائد پر بحث کی جائیگی و ما توفیقی الا باللہ۔

دیکھئے، اپنا خریداری نمبر تلاش کیجئے!

نومبر ۱۹۵۴ء کی اس اشاعت کے ساتھ آپ حضرات کا چندہ (جن کے نمبر خریداری درج ذیل ہیں) ختم ہو گیا ہے لہٰذا آئندہ ماہ دسمبر ۱۹۵۴ء کا پرچہ آپ کی خدمت میں وی پی بھیجا جائیگا۔ اگر آپ مناسب خیال فرمائیں تو ۲۰ نومبر ۱۹۵۴ء سے پہلے پہلے آپ اپنا چندہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرما دیں کہ اس میں ادارہ کو سہولت اور آپ کو کفایت ہے اور اگر کسی وجہ سے خدانخواستہ آپ رسالہ کی خریداری آئندہ جاری رکھنے کا ارادہ نہ رکھتے ہوں تو بھی ۲۰ نومبر سے پہلے پہلے ادارہ کو اپنے اس فیصلہ سے مطلع فرما دیں ورنہ ادارہ کی طرف سے مرسلہ وی پی کو وصول فرمانا آپ کا اخلاقی فریضہ ہوگا۔

فہرست خریداران جن کا چندہ ماہ نومبر کی اشاعت کے ساتھ ختم ہو رہا ہے

۳۸۳ - ۴۰۰ - ۴۳۷ - ۹۰۷ - ۹۴۱ - ۱۱۴۳ - ۱۱۵۸ - ۱۱۶۴ - ۱۱۷۱ - ۱۱۷۲ - ۱۱۷۴ - ۱۱۷۵ - ۱۱۸۲ - ۱۱۸۵ - ۱۱۸۶ - ۱۳۸۴ - ۱۶۳۷ - ۱۶۷۱
۱۶۹۲ - ۱۶۹۷ - ۱۶۹۸ - ۱۷۰۰ - ۱۷۰۱ - ۱۷۰۶ - ۱۷۱۱ - ۱۷۱۲ - ۱۷۱۳ - ۱۷۲۰ - ۱۷۲۱ - ۱۷۲۳ - ۱۷۲۴ - ۱۷۳۰ - ۱۷۳۱ - ۱۷۳۳ - ۱۷۳۴
۱۷۳۵ - ۱۷۳۶ - ۱۷۳۷ - ۱۷۴۱ - ۱۷۴۲ - ۱۷۴۸ - ۱۷۴۹ - ۱۷۵۱ - ۱۷۵۹ - ۱۷۶۰ - ۱۷۶۲ - ۱۷۶۸ -

نوٹ: جواب طلب امور کیلئے جوابی کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف۔

عرفات

عرفات آ کے جو اربابِ نظر غور کریں
حجِ کعبہ کے سب اسرارِ نہانی سمجھیں

ہے پہاڑوں میں وہ میدان کہ اللہ اللہ
جس کو تخئیل کی تصویرِ مکانی سمجھیں

ایک جانب وہ بلندی جبلِ رحمت کی
جس کو میداں کا مقامِ نگرانی سمجھیں

ہیں یہ ملت کے لئے منبر و میداں موجود
کاش ہم اب بھی تو کچھ مقصدِ بانی سمجھیں

جمع ہونے[1] پہ ہے زور اور نمازوں میں کمی
حق نے دی جن کو نظر اس کے معانی سمجھیں

ساری امت کا ہو صرف ایک امیر اور اسے
جانشینِ پیمبرؐ کی نشانی سمجھیں

جمع ہوں جملہ علاقوں کے نمایندے بھی
جو کہ ہر مسئلۂ مالی و جانی سمجھیں

جو مسائل ہوں اہم آ کے بہم پیش کریں
مشکلیں جو بھی ہوں آپس میں زبانی سمجھیں

عقدہ ہو کوئی خصوصی کہ عمومی کھولیں
نکتہ ہو کوئی مکانی کہ زمانی سمجھیں

خوبیٔ سلسلۂ راحتِ باقی جانیں
خامیٔ فلسفۂ عشرتِ فانی سمجھیں

اپنے اندر کی خرابی سے خبردار رہیں
اور اغیار کی ہر ریشہ دوانی سمجھیں

دے امیر آن کے خطبہ جبلِ رحمت پر
حاضرینِ عرفات اس کے معانی سمجھیں

سال بھر کے لئے مل جائیں ہدایات جہاں
پھر تو ہو سامنے پتھر بھی تو پانی سمجھیں

ہے یہ لبیک کا مطلب کہ جو فرمائے امیر
اس کی تعمیل میں دقت نہ گرانی سمجھیں

ایسا حج آئے میسّر جو مسلمانوں کو
بے تامّل اسے جنت کی نشانی سمجھیں

اسد ملتانی

مکہ مکرمہ - ۱۵ اگست ۱۹۵۴ء

[1] عرفات میں ظہر اور عصر کی نمازیں بیک وقت اور آدھی آدھی پڑھی جاتی ہیں۔ (طلوع اسلام)

رفتارِ عالم

فرانس کی اسمبلی نے دو سال کے لیت ولعل کے بعد جمعیت یورپ (E.D.C.) کے منصوبہ کو مسترد کرکے امید و بیم کی طویل و جاں گسل کشمکش کو ختم کیا تو اقوامِ مغرب میں ہمہ گیر افسردگی پھیل گئی اور یہ عام طور پر محسوس کیا جانے لگا کہ نہ محض مغربی دفاع کا ایک اہم قلعہ بھک سے اڑ گیا ہے بلکہ وحدتِ یورپ کا انقلابی تصور جو بتدریج وحدتِ اقوام کا ہیولیٰ ثابت ہو سکتا تھا بغیر عملی تجربے کے خاک نامرادی میں مل گیا ہے۔ اس ظلماتِ یاس میں متعلقہ یورپی دارالحکومتوں میں مضطربانہ بھاگ دوڑ ہوئی اور افہام و تفہیم کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا۔ یوں ستمبر کے آخر میں لندن میں ایک مؤتمر کا راستہ صاف ہوا۔ اس کے شرکاء مندرجہ ذیل نو اقوام تھیں: امریکہ، کینیڈا، برطانیہ، فرانس، مغربی جرمنی، اٹلی، بلجیم، ہالینڈ اور لکسمبرگ۔ مؤتمر لندن کیلئے جو تیاری کی گئی تھی وہ آڑے آئی اور اس میں ایک متفقہ لائحہ عمل طے ہو گیا جس کی تفاصیل عنقریب تیار ہو جائیں گی اور انھیں تمام متعلقہ حکومتوں کی تصویب کے لئے پیش کر دیا جائے گا۔ جمعیت یورپ کے معاہدے کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ فرانس کو جرمنی سے ایسا شدید خطرہ تھا کہ وہ آزاد و مسلح ہو کر اسے روند ڈالے گا کہ وہ اس پر اسوقت تک راضی ہونے کیلئے تیار نہیں تھا جب تک کہ برطانیہ اس معاہدہ کا باقاعدہ رکن نہ بن جائے تاکہ اگر فرانس کو کبھی جرمنی سے خطرہ پیدا ہو تو برطانیہ کی فوجیں اس کے تحفظ کے لئے یورپ میں موجود ہوں۔ برطانیہ یورپی معاملات میں اس حد تک الجھنے کیلئے تیار نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ اپنے آپ کو دیگر عالمی معاملات میں پورا حصہ لینے کیلئے آزاد رکھنا چاہتا تھا۔ لندن کانفرنس میں برطانیہ نے پہلی بار اپنا موقف بدلا یہ اس کی روایتی خارجہ حکمت عملی میں بڑی دور رس تبدیلی ہے۔ برطانیہ نے یہ پیشکش کی کہ اس کی جو فوجیں اسوقت یورپ اور جرمنی میں اتحادیوں کے اعلیٰ کمانڈر کے ماتحت متعین ہیں ان کو برسلز[1] کی معاہدہ اقوام کی اکثریت کی رضامندی کے بغیر واپس نہیں بلایا جائے گا۔ امریکہ نے بھی اپنی دل برداشتگی کے باوصف قریباً اسی قسم کا اعلان کیا۔ ڈلیز نے کہا کہ اگر معاہدۂ برسلز کو وحدت یورپ کا ہیولیٰ بنایا جا سکتا ہے تو میں صدر امریکہ سے سفارش کرونگا کہ وہ اس کو بھی وہی ضمانت دیں جو جمعیتِ یورپ کے منصوبے کو دی گئی تھی۔" یہ ضمانت یہ تھی کہ امریکہ اپنے عساکر کو اس وقت تک یورپ میں رکھے گا جب تک کہ بیرونی حملے کا خطرہ ٹل نہیں جاتا۔

جمعیت یورپ

ان ضمانتوں سے ناامیدیوں کے بادل چھٹ گئے اور دیگر اقوام کے ساتھ فرانس اور جرمنی بھی ایک قابل عمل حل کو منظور کرنے پر تیار ہو گئے۔ امریکہ، برطانیہ اور فرانس جو کم و بیش دس سال سے مغربی جرمنی پر قابض چلے آ رہے ہیں انھوں نے مشترکہ

---

[1] اس تبصرے میں برسلز معاہدہ کا اور بھی ذکر آئیگا کیونکہ موتمر لندن کے فیصلے کی اساس اسی پر قائم ہے۔ یہ معاہدہ ۱۹۴۸ء میں برطانیہ، فرانس، ہالینڈ، بلجیم، لکسمبرگ کے مابین طے پایا تھا اور اس کا مقصد معاہدہ اقوام کو معاشی، ثقافتی اور عسکری سلسلوں میں منسلک کرنا تھا۔ ان اقوام نے یہ طے کیا تھا کہ یورپ میں کسی ایک قوم پر مسلح حملہ ہوا تو سب کے سب اس کی مدد کو پہنچیں گے۔ عسکری نقطۂ نگاہ سے بات اس اعلان سے آگے نہ بڑھ سکی کیونکہ ایک ہی سال بعد یعنی ۱۹۴۹ء میں ناٹو کا معاہدہ تیار ہو گیا اور تمام توجہ اس کیلئے مشترکہ فوج تیار کرنے پر صرف ہو گئی۔ معاہدہ ناٹو میں ۱۴ قومیں شریک ہیں اور اس کی مشترکہ فوج کی تعداد ستر لاکھ ہے۔ دیگر آلات حرب و ضرب کا اندازہ اس کے مطابق لگایا جا سکتا ہے۔

اعلان کیا کہ جرمنی ایسے عظیم ملک کو تادیر آزادی اور جمہوریت کے حقوق سے محروم نہیں رکھا جا سکتا لہٰذا اسے کم سے کم وقت میں اس قبضے سے فارغ کر دیا جائے۔ اسکے بعد یہ طے پایا کہ مغربی جرمنی کو ناٹو کا پندرہواں رکن بنایا جائے اور اسے اسی قدر فوج ۔ بارہ ڈویژن اور ایک ہزار ہوائی جہاز ۔ ناٹو کے سپرد کرنے کو کہا جائے جو اسے معاہدہ جمعیت یورپ کے حوالے کرنا تھی۔ اس کے ساتھ ناٹو کے کمانڈر کے اختیارات میں ایسی توسیع کر دی جائے کہ وہ جرمن افواج کے آزادانہ استعمال کا تدارک کر سکے۔ جرمنی (اور اسکے ساتھ اٹلی کو بھی) برسلز معاہدہ میں بھی شریک کیا جائیگا اور اسے یہ اختیار دیا جائیگا کہ وہ یہ فیصلے کرے کہ یورپی ارکان تیار سے زیادہ کتنی فوج ناٹو کے حوالے کریں نیز وہ یورپی بالخصوص مغربی جرمنی کی اسلحہ سازی کی بھی نگرانی کر سکے۔ ڈاکٹر ایڈی نار (جرمن چانسلر) نے عہد کیا کہ وہ یورپی نگرانی کے پابند رہیں گے اور ایٹمی، کیمیاوی وغیرہ آلات کی پیداوار سے باز رہیں گے۔

موتمر لندن کہنے کو تو کامیاب ہو گئی اور اقوام مغرب کو پھر ایک سہارا مل گیا لیکن اسکے بعد یہ سوال باقی تھا کہ فرانس کی اسمبلی میں اس کا کیسا استقبال ہوگا۔ خود ڈاکٹر ایڈینار کے لئے بھی اپنی پارلیمان میں اسے منظور کرانا آسان نہیں تھا کیونکہ فرانس کے رویے نے ان کے مخالفین کو اور مشتعل کر دیا تھا انھوں نے بہرحال بڑی جرأت سے کام لیا اور اس معاہدہ کو منوا ہی لیا۔ اسی طرح فرانس کے وزیر اعظم مینڈس فرانس نے اپنی اسمبلی میں مخالفت کے علی الرغم اعتماد کا ووٹ حاصل کیا۔ اس سے لندنی معاہدہ کی عملی کامیابی کے امکانات روشن تر ہو جاتے ہیں لیکن یہ خدشہ اب بھی موجود ہے کہ کہیں فرانس کی اسمبلی تفصیلات کی تصدیق کرنے سے انکار نہ کر دے۔ جمعیت یورپ کے معاہدہ کی تصدیق سب سے پہلے جرمنی نے کی تھی۔ اب ظاہر ہے کہ وہ فرانس کا رویہ دیکھے گا اور اس وقت تک اسکی تصدیق کیلئے تیار نہ ہو گا جبتک کہ فرانس تصدیق نہ کر دے۔ گو بظاہر حالات کی رفتار ایسی ہے کہ اس سے توقع کی جا سکتی ہے کہ ای ڈی سی کی ناکامی کے بعد فرانس دوسری ناکامی کا ذمہ دار نہیں بنے گا کیونکہ اس صورت میں فرانس کا اپنا مستقبل مخدوش ہو جائیگا لیکن حالات کا رخ بدلتے دیر نہیں لگتی اور مستقبل کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ معاہدہ جمعیت یورپ کو ناکام بنانے میں ایک حد تک روس کا ہاتھ ہے۔ وہ وقتاً فوقتاً جرمنی کے سامنے وحدت کا سبز باغ پیش کرتا رہتا ہے جس سے جرمنی کے علاوہ اہل یورپ بھی یہ سمجھنے لگ جاتے ہیں کہ شاید کسی عالمگیر معاہدہ کی شکل نکل آئے اور اسکے سر سے جنگ کی بلا ٹل جائے۔ اب بھی لندن کانفرنس کے فیصلے کے لگ بھگ روسی وزیر خارجہ مالوٹوف نے پھر ایسی ہی پیشکش کر دی۔ اس نے مشرقی برلن میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ لندنی فارمولا وحدت جرمنی کو ناممکن بنا دیگا، لہٰذا دول اربعہ عظمیٰ کو مل کر اسکی کوئی صورت پیدا کرنی چاہیئے۔ اس نے یہ مبہم سی بات بھی کہی کہ آیئے مل کر غیر ملکی فوجوں کے انخلا کی تجویز کریں اس کے بعد روس کل جرمن انتخابات کی قابل عمل تجویز پر غور کرنے کیلئے تیار ہو گا امریکہ میں اسے ایک روسی فریب سے موسوم کیا گیا ہے۔ برطانیہ کے وزیر خارجہ نے کہا کہ روس ایسی شرائط کے ساتھ جرمن کو متحد کرنا چاہتا ہے جو اس مملکت کا خاتمہ کر دینگی۔ انھوں نے یہ بھی انتباہ کیا کہ اگر اقوام مغرب نے لندنی معاہدہ کو قابل عمل نہ بنایا تو ان کے دفاع اور بچاؤ کی کوئی صورت باقی نہیں رہیگی۔ فرانس کے وزیر اعظم نے کہا کہ مغرب معاہدۂ لندن کی تعمیل میں مصروف رہیگا البتہ روسی تجویز پر سنجیدگی سے غور کریگا مغربی جرمنی کا ردعمل یہ ہے کہ روسی تجاویز کا انتظار کرنا چاہیئے۔ اقوام مغرب کے اس ردعمل سے یہ تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ روسی فریب میں آ کر اپنی دفاعی تنظیم کی تشکیل کو ملتوی نہیں کرینگی لیکن عین ممکن ہے کہ بتدریج ردعمل اس قسم کا ہو جائے کہ روسی تجاویز کو آزما لینا چاہیئے۔ اگر ایسا ہو گیا تو وحدت یورپ کا دوسرا مغربی منصوبہ بھی کامیابی کے امکانات سے محروم ہو جائے گا۔

کشمکشِ شرق و غرب

جیسا کہ کئی بار لکھا جا چکا ہے، روس کی سیاست کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ وہ اقوام مغرب کی تجاویز کو بیروئے کار لانے سے روکے یا ان کو زیادہ سے زیادہ دیر تک معرض التوا میں ڈالتا چلا جائے۔ یہی کچھ اس نے وحدت یورپ کے سلسلہ میں کیا۔ اب یہی کچھ اس نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں کرنا شروع کر دیا ہے۔ اسمبلی کا نواں سالانہ اجلاس شروع ہو چکا ہے اور شرق و غرب کی سرد جنگ کا ایک اچھا خاصا اکھاڑہ بن گیا ہے۔

اسمبلی کے سامنے ابتداءً عالمی سیاست کا انتہائی اختلافی مسئلہ آیا جبکہ روس نے تجویز پیش کی کہ سرخ چین کو اقوام متحدہ کا رکن بنا لیا جائے۔* امریکہ اس تجویز کا سخت سے مخالف ہے وہ اسے ٹالنے میں کامیاب ہو گیا اور فیصلہ یہ ہوا کہ اس معاملہ کو ایک سال کیلئے ملتوی کر دیا جائے۔ اس روسی حملے کا مداوا کر کے امریکہ نے جوابی حملہ کیا اور اقوام متحدہ پر واضح کیا کہ کس طرح امریکہ کو جگہ بہ جگہ روسی جارحانہ کارروائیوں کا مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ اس طرح زمین تیار کرنے کے بعد امریکی نمائندے نے بتایا کہ ایک سال پیشتر صدر آئزن ہاور نے اقوام متحدہ کی زیر نگرانی جوہری مرکز بین وحدت قائم کرنے کی پیشکش کی تھی کہ یہ توانائی دنیا بھر کی ضروریات امن کیلئے استعمال کی جا سکے۔ اسے روس نے قدم قدم پر ناکام بنانے کی انتہائی کوشش کی ہے اسی سے منسلک تحدید اسلحہ کا مسئلہ ہے جس کا گذشتہ آٹھ سال کے مذاکرات کے باوصف کچھ تصفیہ نہیں ہو سکا۔ روس کا مطالبہ ہے کہ ایٹم بم سلحہ کو ممنوع قرار دیا جائے اور باقی اسلحہ میں یک تہائی کی تخفیف کر دی جائے اور پھر بقایا اسلحہ کا معائنہ کیا جائے۔ اقوام مغرب ان تجاویز کو اسلئے منظور کرنے کیلئے تیار نہیں کہ اس طرح روس کی برتری یقینی ہو جاتی ہے اور اس کی کچھ ضمانت نہیں رہتی کہ روسی اسلحہ کو قابو میں رکھا جا سکے گا۔ اب روسی نمائندے نے قدرے مختلف تجویز پیش کی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ چھ ماہ کے اندر اندر ایٹمی آلات کی پیداوار ختم کر دی جائے۔ دوسرے اسلحہ بھی چھ ماہ سے ایک سال کے عرصہ میں متفقہ معیار پر نصف کر دیئے جائیں اور بین الاقوامی نگرانی اور معائنہ کی صورت پیدا کی جائے۔ ان تجاویز کا مقصد بھی یہی ہے کہ اقوام مغرب کے سامنے یہ موہوم امید پیش کر دی جائے کہ روسی حکمت عملی میں ایسی تبدیلیوں کے آثار ملتے ہیں جن کے پیش نظر خاطر خواہ معاہدہ کی توقع کی جا سکتی ہے۔
لیکن ظاہر ہے کہ جو معاملہ آٹھ سال سے الجھا چلا آ رہا ہے وہ اب کیسے حل ہو سکے گا۔

جنرل اسمبلی کا اجلاس

جہاں تک جنرل اسمبلی کے اجلاس کا تعلق ہے اسکے سامنے بیشتر تو وہی دیرینہ مسائل ہیں جن کا کچھ حل تلاش نہیں کیا جا سکا اور بعض نئے مسائل کا بھی اضافہ ہو گیا ہے مثلاً ایک مسئلہ مغربی نیوگنی کا ہے۔ پانچ سال پیشتر جب ہالینڈ اور انڈونیشیا میں معاہدہ آزادی ہوا تھا تو یہ طے ہوا تھا کہ دونوں ممالک علیحدہ مذاکرات کے ذریعہ اس کے مستقبل کا فیصلہ کریں گے۔ انڈونیشیا تشدد طور پر اس علاقہ کی واپسی کا مطالبہ کر رہا ہے ہالینڈ نے عملاً تمام مذاکرات کو ناممکن بنائے رکھا یہی وجہ ہے کہ اتنا عرصہ گذر جانے کے بعد بھی کچھ تصفیہ نہیں ہو سکا۔ انڈونیشیا نے بالآخر تنگ آ کر یہ مسئلہ اقوام متحدہ میں پیش کر دیا ہے۔ دوسرا اہم مسئلہ جزیرہ قبرص کے مستقبل کا ہے۔ یہ جزیرہ کبھی ترکی مملکت کا حصہ تھا پھر اسے برطانیہ نے ہتھیا لیا چنانچہ اس پر اب تک وہی قابض چلا آ رہا ہے۔ اسکی بیشتر آبادی یونانی نسل ہے اور بقایا ترک ہیں۔ یونانی جزیرے کا الحاق یونان سے چاہتے ہیں چنانچہ وہ برطانیہ سے کوئی ایسی اصلاحات قبول کرنے کیلئے تیار نہیں جو انھیں آزادی کی راہ پر تو گامزن کریں لیکن یونان سے ملنے نہ دیں۔ ترک ظاہر ہے کہ ترکی سے الحاق کے متمنی ہیں۔ برطانیہ اس جزیرے سے دستکش نہیں ہونا چاہتا۔ سویز کے معاہدے کے بعد قبرص اس کیلئے اور اہم ہو گیا ہے کیونکہ یہی اسکی مشرق وسطی کی افواج کا مرکز ہوگا۔ امریکہ کیلئے اس میں خاصا بدمزگی کا پہلو ہے کیونکہ دونوں — برطانیہ اور یونان — ناٹو کے رکن ہیں اور ان کے درمیان کشیدگی مستحسن نہیں ہو سکتی۔ اس کشیدگی کی نوعیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ برطانیہ قبرص کے مسئلہ کو زیر بحث لانے کیلئے بھی تیار نہیں۔ بہرحال ان مسائل کے حل کی توقع عبث ہے جیسا کہ نئے سکرٹری جنرل اسمبلی نے اپنی سالانہ رپورٹ میں کہا ہے کہ اقوام متحدہ ایسے مسائل بھی حل کرنے سے قاصر رہی ہے جنہیں متعلقہ حکومتوں نے اسکی ذمہ داری کو تسلیم کر لیا تھا جب تک یہی صورت حال ہے اقوام متحدہ سرد جنگ کا ایک محاذ بنی رہیگی۔
جہاں قبرص نے دو مغربی اقوام میں کشیدگی پیدا کر دی ہے وہاں ٹریسٹ سے متعلق کشیدگی کے رفع ہونے کی بھی صورت پیدا ہو گئی ہے اور اقوام مغرب کیلئے یہ نیک فال ہے

---

* ایک طرف روس سرخ چین کو اقوام متحدہ میں لانے کیلئے یہ کچھ کر رہا ہے اور دوسری طرف چین یہ قانونی نکتہ ابھار رہا ہے کہ چین تو در اصل اقوام متحدہ کا رکن ہے لہٰذا اسکے از سر نو ممبر بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس ضمن میں کوشش ہو رہی ہے کہ اس قانونی نکتہ کو فیصلے کیلئے بین الاقوامی عدالت میں پیش کیا جائے۔

ٹریسٹ کا مسئلہ جنگ کے خاتمہ سے لیکر اب تک لاینحل پڑا تھا اور کوئی حل نہ ہو سکنے کی وجہ سے امریکہ اور برطانیہ کی فوجیں اس پر قابض چلی آرہی تھیں۔ ۱۹۴۷ء میں اٹلی سے جو معاہدہ صلح کیا گیا تھا اس میں یہ شرط تھی کہ ٹریسٹ کو آزاد علاقہ بنایا جائیگا اور اس کا گورنر سلامتی کونسل کی طرف سے نامزد ہوگا۔ سلامتی کونسل آج تک کسی ایک گورنر پر متفق نہ ہو سکی جس کی بدولت ٹریسٹ منقسم رہا۔ شمالی حصے میں حلقہ (الف) ہے اور ٹریسٹ کا شہر۔ اس کی آبادی بیشتر اطالوی ہے۔ یہ حصہ امریکی اور برطانوی فوجوں کے قبضہ میں چلا آرہا ہے۔ اس علاقے کا حلقہ ب یوگوسلاویہ کی فوجوں کے قبضہ میں چلا آرہا ہے۔ گذشتہ سال امریکہ اور برطانیہ نے اعلان کیا کہ وہ حلقہ (الف) اٹلی کے سپرد کر دیتے ہیں اور حلقہ ب یوگوسلاویہ کے پاس ہی رہیگا لیکن اس اعلان پر ایک طوفان مچ گیا اور صورت حال جنگ کی سی پیدا ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس اعلان پر عمل ملتوی کر دیا گیا۔ بہرحال در پردہ مذاکرات جاری رہے اور اب لنڈن میں یہ فیصلہ ہوا ہے کہ اٹلی حلقہ (الف) پر قابض ہو جائے اور یوگوسلاویہ حلقہ ب کو اپنے قبضے میں رکھے۔ حلقہ (الف) کا تھوڑا سا حصہ جس میں سلاوی آبادی ہے یوگوسلاویہ کو دیدیا جائے گا۔ امریکہ اور برطانیہ ماہ نومبر تک اپنی فوجیں واپس بلالیں گے۔ ٹریسٹ کو اٹلی اور یوگوسلاویہ دونوں کیلئے کھلا رکھا جائیگا اور دونوں ملکوں کے شہریوں میں کوئی امتیاز نہیں کیا جائیگا۔ گو یہ فیصلہ وہی ہے جس کا اعلان گذشتہ سال ہوا تھا لیکن یوگوسلاویہ سے اسے منوالینا امریکہ اور برطانیہ کی نمایاں کامیابی ہے۔

امریکہ ان دنوں کانگرس (ایوان نمائندگان اور سینیٹ) کے انتخابات میں منہمک ہے۔ یہ انتخابات اسلئے اہم ہیں کہ ان کے نتائج سے اندازہ ہو سکے گا کہ ۱۹۵۶ء کے صدارتی انتخابات میں کس پارٹی کی جیت ہوگی۔ اگر ڈیموکریٹ جیت گئے تو یہ کہا جا سکے گا کہ امریکی آئزن ہاور کی ری پبلکن پارٹی سے بددل ہو گئے ہیں اور اب اس کی حکومت نہیں چاہتے۔ اس کے برعکس اگر ری پبلکن پارٹی کی جیت ہوگئی تو توقع کی جاسکے گی کہ صدر آئزن ہاور کی حکومت اور چلے گی۔ معمولاً یہی اندازہ ٹھیک ہے گو ایک مرتبہ یعنی ۱۹۴۸ء میں ایسا بھی ہو گیا تھا کہ ری پبلکن پارٹی۔ جو برسر حکومت نہیں تھی۔ کانگریس کے انتخابات جیت گئی تھی لیکن صدارتی انتخاب میں وہ ہار گئی تھی چنانچہ صدر ٹرومین بدستور صدر رہے تھے۔ اس انتخاب میں ملک کی معاشی اور خارجہ حکمت عملیاں نزاعی امور ہوں گی۔ نتیجہ ۲ نومبر کو سامنے آجائے گا۔

عدم توازن اور خلفشار

ممالک مسلمہ کی سیاست چند افراد کے ہاتھوں میں گھر کر رہ جانے کی وجہ سے غیر متوازن اور مبتلائے خلفشار ہے۔ جب تک ملل متعلقہ کے اعماق قلوب سے حرکت و عمل کے چشمے نہیں پھوٹتے کسی استواری کی توقع عبث ہے۔ انہی دنوں لیبیا میں بحرانی صورت پیدا ہوگئی جبکہ شاہ لیبیا کے چچا زاد بھائی نے اس کے معتمد خاص اور قصر شاہی کے امور کے مدیر کو قتل کر دیا۔ کچھ عجب نہیں کہ اس سے موجودہ وزیر اعظم کی حکومت ہی بدل جائے۔ یہ بحران کچھ عرصہ سے ابھر رہا تھا۔ چنانچہ اس قتل سے کوئی ایک ہفتہ پیشتر لیبیا کے سب سے بڑے صوبے کے والی کو معطل کر دیا تھا کیونکہ اس نے شاہی احکام ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ قتل کے بعد یہ حکم منسوخ ہو گیا اور سائرانیکا کے صوبے میں ہنگامی صورت حال کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ خلفشار ایک ایسے وقت پیدا ہوا جبکہ لیبیا کی پارلیمان ملک میں امریکی ہوائی اڈوں کے قیام پر بحث کر رہی تھی۔

جہاں تک مصر کا تعلق ہے سویز کے تصفیہ کے باوجود اسکے کوائف میں ٹھہراؤ پیدا نہیں ہو سکا۔ اول تو ابھی معاہدہ سویز پر دستخط ہی نہیں ہو سکے گو تازہ خبروں سے پتہ چلتا ہے کہ برطانیہ اور مصر کے اختلافات قریباً ختم ہو گئے ہیں اور دستخط جلدی ہو جائیں گے۔ اسکے علاوہ اندرون ملک فضا تسلی بخش نہیں۔ مصر کی فوجی حکومت نے برسر اقتدار آتے ہی سیاسی جماعتوں کو معطل کر دیا تھا۔ یہ سلوک اخوان المسلمون سے روا نہیں رکھا گیا تھا جو ملک کی سب سے بڑی منظم اور موثر جماعت ہے۔ بعد میں اسے بھی معطل کر دیا گیا تھا لیکن دو ہی ماہ کے بعد یہ پابندی ہٹا دی گئی۔ اس کے بعد کوشش یہ رہی کہ یہ جماعت حکومت کی پالیسی کو اپنا قاعدہ بنائے جو مصری فوجی حکومت کے موافق

نہیں ہو سکے۔ لیکن باوجود کوشش ایسا نہیں ہو سکا۔ اخوان المسلمون نے حکومت کی خواہش کے باوصف حدیبی کو اپنا قائد منتخب کر لیا۔ اس پر حکومت نے حدیبی کو گرفتار کر لیا۔ اب ان پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلیگا۔ ہو سکتا ہے کہ جماعت کو خلاف قانون قرار دیدیا جائے گو جماعت کی غیر معمولی ہر دلعزیزی کے پیش نظر اس اقدام سے احتراز بھی کئے جانے کا احتمال ہے۔ جماعت کے مبلغ اعلیٰ، سبائی نے دمشق میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حکومت مصر اپنا اعتماد کھو چکی ہے انھوں نے عربی حکمرانوں سے اپیل کی ہے کہ وہ مداخلت کر کے اخوان المسلمون کو اس ظلم سے بچائیں اور مصر کو خانہ جنگی کا شکار نہ ہونے دیں۔

اکتوبر کے آخر میں مصر کے کالج وغیرہ کھل جائینگے۔ کالجوں کو بہت پہلے کھل جانا چاہئے تھا لیکن چھٹیوں میں دو مرتبہ توسیع کر دی گئی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ کالج کھل جانے پر حکومت کے خلاف طلبہ کے مظاہرے شروع ہو جائیں گے طلبہ میں خاصا طبقہ، وفد، اخوان المسلمون اور کمیونسٹوں کا ہے یہ "متحدہ محاذ" اپنی اپنی اغراض کیلئے حکومت کا مخالف ہے۔ فوجی حکومت نے ایک طرف تو کالجوں کی چھٹیوں میں دو مرتبہ جبری توسیع کر دی دوسری طرف وہ کالجوں پر تسلط زیادہ کر رہی ہے تاکہ طلبہ کی شورش کا تدارک ہو سکے یا ان کی واپسی تک معاہدہ سویز پر دستخط ہو جائیں اس سلسلہ میں کوئی چالیس پروفیسروں کو برخواست کر دیا گیا ہے کیونکہ وہ حکومت کے مخالف سمجھے جاتے تھے۔ مزید براں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ کالج کے ڈین کالج کی طرف سے مقرر نہ ہوں بلکہ وہ براہ راست وزارت تعلیم کے نامزدگان ہوں چنانچہ حکومت کی طرف سے تمام کالجوں کیلئے نئے ڈین مقرر کر دیئے گئے ہیں گو اس کا اعلان نہیں ہوا لیکن سنا جاتا ہے کہ یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ شورش پسند طلبہ کے خلاف سخت اقدامات کئے جائیں تاکہ انھیں سبق حاصل ہو۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کالجوں پر پہرہ سخت کر دیا جائیگا۔

مصر کی فوجی حکومت نے ایک ایسا اقدام کیا ہے جس کی مثال شاید ہی مل سکے، حال ہی میں ایک دو اماموں نے خطبات جمعہ میں حکومت پر نکتہ چینی کی اس کے خلاف حکومت نے یہ کارروائی کی ہے کہ کسی امام کو اپنی طرف سے جمعہ کا خطبہ پڑھنے کا حق حاصل نہیں۔ اب ہر امام کو حکومت کی طرف سے تیار شدہ خطبے دیدیئے جایا کرینگے اور اماموں کا فریضہ صرف انھیں سنا دینا ہوگا اور بس۔ حکومت آزادی رائے کو کچلنے کیلئے یہاں تک پہنچ جائے تو ملک کا اللہ ہی مالک ہے!

شام میں حال ہی میں انتخابات ہوئے ہیں۔ یہ ملک آزادی کے بعد فوجی "انقلابوں" کا ہی شکار رہا۔ اس سال کے شروع میں ایک اور "انقلاب" آیا جسکی وجہ سے سابق آمر شیشاکلی کو ملک سے نکال دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ اعلان کیا گیا تھا کہ ملک میں پارلیمانی حکومت کو دوبارہ رائج کیا جائیگا۔ اس اعلان کے مطابق جو انتخابات ہوئے ہیں ان کے نتائج عبرتناک ہیں۔ ۱۴۲ کے ایوان میں ایک پارٹی بھی اکثریت حاصل نہیں کر سکی جو سب سے بڑا گروہ کامیاب ہوا وہ آزاد امیدواروں کا ہے اور انھوں نے اب دوسری پارٹیوں سے ملنا شروع کر دیا ہے۔ گویا شام مستحکم حکومت کی توقع نہیں رکھ سکتا۔ چنانچہ بعض حلقوں میں یہ کہا جانے لگا ہے کہ شاید پھر سے انتخابات کرائے جائیں۔ انتخابات کا حربہ بجا لیکن جب تک جمہوری اصولوں کے مطابق پارٹیاں نہیں بنتیں ان انتخابات سے کیا حاصل ہو سکیگا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ چند افراد اپنے اثر و رسوخ کے زور پر کامیاب ہو جائیں گے اس سے ملک کا بھلا نہیں ہو سکتا۔ انتخابات کا عبرتناک پہلو یہ ہے کہ ایک کمیونسٹ امیدوار بھی کامیاب ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ کم و بیش ایک درجن امیدوار ایسے ہیں جو کئی "سوشلسٹ" ناموں سے کامیاب ہوئے ہیں۔ وہ بالعموم اس کمیونسٹ کا ساتھ دیں گے۔ یہ نتیجہ ہے ڈانواں ڈول سیاست کا۔

ہمارا ہمسایہ افغانستان جسے پاکستان کا وجود ایک آنکھ نہیں بھاتا ابھی تک کسی کروٹ بیٹھ نہیں سکا۔ اس سے مذاکرات ایک عرصہ سے جاری ہیں اور گو یہاں تک خبریں آئی ہیں کہ پاکستان اور افغانستان کا وفاق پیش نظر ہے اور اسکی تفاصیل طے ہو رہی ہیں لیکن ہنوز کچھ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ سیاسی تعلقات کی استواری کے ساتھ ساتھ تجارتی روابط کا قیام بھی حالات کے تقاضے کے عین مطابق ہے لیکن دلوں میں اخوت و مودت کے جذبات ایسے غائب ہو چکے ہیں

کوئی قابل عمل مفاہمت نہیں ہو سکی۔ افغانستان نے ان دنوں روس سے تجارتی معاہدہ کیا ہے جسکے مطابق وہ اپنے عظیم ہمسائے سے دو لاکھ ڈالر کی اشیائے ضرورت خریدیگا۔ گو اس سے زیادہ تفاصیل شائع نہیں ہوئیں تاہم کہا جاتا ہے کہ اسکے معاوضے میں وہ اپنی خام اشیا روس کو بھیجے گا اس سے پہلے افغانستان چیکوسلواکیہ کے ساتھ ایک معاہدہ کر چکا ہے جسکی رو سے اسے پانچ لاکھ ڈالر کے کپڑا تیار کرنے کی مشینیں بطور قرض دیگا۔ اس قرض کی ادائیگی تین سال کے بعد شروع ہوگی اور وہ افغانی اشیائے خام کی شکل میں ہوگی۔ روس کے ساتھ ایک معاہدہ اسلئے بھی کیا گیا ہے کہ وہ خوراک جمع کرنے کے گودام جگہ بہ جگہ بنا دے۔ اس سلسلہ میں کئی روسی ماہرین افغانستان پہنچ چکے ہیں اور وہ کام کر رہے ہیں۔ کمیونسٹ ملکوں سے یہ تعلقات کتنے ہی سود مند کیوں نہ نظر آتے ہوں وہ مضرت سے خالی نہیں بالخصوص جبکہ سامنے افغانستان جیسا غریب و پسماندہ ملک ہو۔

ہندوستانی سیاست

ہندوستان کا ایک دلچسپ واقعہ "ناگاری پبلکن فیڈریشن" کا قیام ہے۔ گو ہندوستانی پریس میں اس خبر کی تردید کی گئی ہے لیکن اس کا قیام بعید از قیاس نہیں۔ ناگا قبائل بیشتر عیسائی ہیں اور ان کا تناسب خواندگی ہندوستان سے کہیں زیادہ ہے ان کا پانچ ہزار مربع میل کا علاقہ کوئلے اور تیل سے معمور ہے۔ وہ برطانیہ کی ماتحتی میں بھی آزادی کا مطالبہ کرتے رہے ہیں۔ سائمن کمیشن کے سامنے پہلی مرتبہ انھوں نے آزاد ناگا مملکت کا مطالبہ کیا۔ جب برصغیر میں آزادی کی تحریک کو فروغ حاصل ہوا تو ناگا قبائل کو اپنے مستقبل کی فکر ہوئی۔ حکومت ہند نے ۱۹۴۶ء میں ان سے گورنر آسام کی معرفت سلسلہ جنبانی کی اور ان کا یہ حق تسلیم کر لیا کہ انھیں اپنی خواہشات کے مطابق ترقی کرنی چاہئے۔ ۱۹۴۷ء میں ناگا کا ایک وفد مسٹر گاندھی سے ملا تو انھوں نے تسلیم کیا کہ ہندوستان کو یہ حق حاصل نہیں کہ ناگا علاقے کو زبردستی اپنے آپ میں جذب کر لے۔ انھوں نے وفد کو یہ بھی کہا کہ اگر ہندوستان نے ایسی زبردستی کی تو وہ اس کا مقابلہ کریں گے اور اس کیلئے اپنے سینے پر گولی کھانے کیلئے تیار ہوں گے۔ حکومت ہند سے ناگا قبائل کا جو معاہدہ ہوا وہ قابلِ عمل نہ ہو سکا اور ہندوستان نے رفتہ رفتہ اسکی خلاف ورزی شروع کر دی۔ تیل والا کچھ علاقہ ہتھیا لیا گیا اور ناگا کی رسومات و روایات میں بھی دخل اندازی شروع کر دی گئی۔ ناگا قبائل نے ہندوستانی دستور کو اب تک تسلیم نہیں کیا نہ انھوں نے انتخابات میں حصہ لیا۔ ان حالات میں کوئی عجب نہیں کہ انھوں نے آزاد جمہوریہ کا اعلان کر دیا ہو۔

ہندوستان کمیونسٹوں سے بدستور محبت کی پینگیں بڑھائے چلا جا رہا ہے۔ پچھلے دنوں جینوا کانفرنس سے واپسی پر چین کے وزیر اعظم چو این لائی ہندوستان آئے تو اب پنڈت نہرو چین کیلئے روانہ ہو گئے ہیں وہ راستے میں برما اور کمیونسٹ ویٹ نام میں بھی رکیں گے اور انھیں بھی یہی سبق پڑھائینگے کہ وہ کمیونسٹ چین سے عدم تعرض کا معاہدہ کریں۔ کہنے کو تو یہ ٹھیک ہے کہ اگر ایشیائی اقوام سرخ چین سے اس قسم کے معاہدے کر لیں تو وہ محفوظ ہو جائینگی لیکن پنڈت نہرو اور ان کی باتوں میں آنے والی قومیں یہ بھول رہی ہیں کہ مغرب سے کٹ کر وہ بالکل کمیونسٹوں کے رحم و کرم پر ہونگی۔ پنڈت جی لگے ہاتھ سیٹو کے خلاف بھی فضا تیار کر رہے ہیں اور یہ دلیل دے رہے ہیں کہ امن قائم کرنے کا یہ طریقہ صحیح نہیں۔ انڈونیشیا کے وزیر اعظم نے حال ہی میں نئی دہلی کا سفر کیا تو انھوں نے اس پر صاد کیا۔ اگر نہرو کی یہ پالیسی کامیاب رہی تو اس سے سیٹو کو جو نقصان پہنچے گا سو پہنچے گا، اس سے کمیونزم کیلئے ایشیا میں راستہ صاف ہو جائیگا اور اس کامیابی کا سہرا پنڈت جی کے سر بندھے گا۔ غالباً پنڈت جی بھی اس نتیجہ کے لئے تیار نہیں ہوں گے لیکن قیادت کا جنون ان سے وہ کچھ کرا رہا ہے جو ایک معمولی سیاست دان سے بھی بعید ہے۔

ہندی سلطنت کا خواب

پنڈت نہرو کا یہ سفر دراصل ایک اور قدم ہے اس منزل کی جانب جس پر وہ قدم بہ قدم چلتا جا رہا ہے۔ اس منزل مراد کو

"علاقہ امن" کا نام دیا جارہا ہے لیکن اسکے سائے میں ایک وسیع تر ہندو سلطنت کیلئے راستہ صاف کیا جارہا ہے۔ اب آثار و قرائن سے اندازہ کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ ہندو اس کا کھلم کھلا چرچا کر رہے ہیں۔ ہندوستان کے مشہور سیاست دان سردار پانیکر جو چین اور مصر میں سفیر رہ چکے ہیں اور خارجہ حکمت عملی کے مصنفین میں سے تسلیم کئے جاتے ہیں انھوں نے حال ہی میں ایک تقریر میں خالصتاً مغربی استعمار پسندوں کے تتبع میں اپنا موقف بیان کیا۔ آپ نے فرمایا کہ برما، سیلون، افغانستان، سیام، ہند چینی، کمبوڈیا، لاؤس ہندوستان کیلئے "بیرونی دائرہ" یا ثانوی دفاعی خط کی حیثیت رکھتے ہیں لہٰذا ہندوستان کو ہشیاری سے کام لیکر دیکھنا ہوگا کہ کوئی مخالف قوت ان علاقوں میں ابھر نہ سکے کیونکہ وہ ہندوستان پر باؤڈال سکے گی (یہی وجہ ہے کہ ہندوستان سیٹو کی مخالفت کرکے امریکہ کو اور چین کی خوشامد کرکے کمیونسٹوں کو اس علاقہ میں دخیل ہونے سے روک رہا ہے!) واضح رہے کہ ہندوستان کے "بیرونی دائرہ" میں پاکستان شامل نہیں کیونکہ پاکستان کو تو ہندوستان ہی کا حصہ سمجھا جاتا ہے اسی لئے یہ دائرہ برما اور افغانستان سے شروع ہوتا ہے۔ اس کا مزید ثبوت مسٹر باؤلز سابق سفیر امریکہ متعینہ دہلی کے حالیہ مضمون میں ملتا ہے۔ اس میں تحریر ہے:-

> ہندوستان اپنی قدامت پر ہی فخر نہیں کرتا بلکہ وہ تعلی سے کہتا ہے کہ جنوبی ایشیا میں اسکی نوآبادیات رہی ہیں۔ اشوک کے وقت سے لیکر مغربیوں کی آمد تک ہندوستان تہذیب، تجارت اور فتح کا مرکز رہا ہی نہیں بلکہ "عظیم تر ہندوستان" ایک تاریخ کی کتاب کا عنوان ہے جسے میرے بچے بھی دہلی کے سکول میں پڑھتے رہے۔ اس کے نقشے میں سیلون، برما، جاوا، سماٹرا، بورنیو، بالی اور کمبوڈیا ہندوستانی نوآبادیات کی حیثیت سے دکھائے گئے ہیں۔

مسٹر باؤلز آگے چلکر لکھتے ہیں کہ اس کتاب کے مصنفین ہندوستانی بچوں کو یہ سبق دیتے ہیں کہ ہندو نوآبادکار "تہذیب کی روشنی اور اس کی برکات" پسماندہ علاقوں میں پھیلاتے جاتے تھے۔ نہرو کے متعلق انھوں نے لکھا ہے کہ انھوں نے اعتراف کیا کہ جب ان پر جنوبی ایشیا میں ہندوستان کی تاریخی اہمیت منکشف ہوئی تو وہ جذبات سے بے قابو ہو گئے

مسلمانانِ ہندوستان

جیسا کہ گذشتہ تبصرے میں لکھا گیا تھا اس ہندو استعماریت کی ٹکر براہ راست پاکستان سے ہوگی۔ یوں تو گذشتہ سات سال سے یہ استعماری قوتیں پاکستان کے خلاف برسرپیکار ہیں لیکن کوئی وقت جاتا ہے کہ زور کا ران پڑیگا۔ اندرون ہند اس کیلئے جو تیاریاں ہو رہی ہیں ان کا پرتو ہندوستان کے وزیر داخلہ ڈاکٹر کاٹجو کے ایک مضمون میں ملتا ہے جسے ہندوستانی حکومت نے از خود اشاعت کیلئے دیا ہے۔ یہ مضمون گاندھی کے یوم پیدائش کے موقع پر لکھا گیا ہے اس میں انھوں نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندوت ایک خدا کو مانتا ہے اور نہ مانتے میں فرق نہیں کرتا۔ اس کے برعکس اسلام اور عیسائیت "ہمارے غیر ملکی مذاہب" ایسے امتیازات قائم کرتے ہیں جن سے خرابی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے بعد مسلمان شاہوں کی باری آتی ہے۔ کاٹجو کے نزدیک ان میں سے بعض قابل عزت تھے اور بعض نے عدم رواداری کا ثبوت دیا۔ اسی لئے وسیع پیمانے پر ترک مذہب ہوا اور مندروں کی بے حرمتی بھی کی گئی اور ان کو گرا کر ان کے بجائے مسجدیں تعمیر کی گئیں۔ ایسے مسمار مندر ہندوستان میں ہر جگہ ملتے ہیں۔ ڈاکٹر کاٹجو مسلمانوں کی موجودہ نسل کو اس کیلئے ذمہ دار نہیں گردانتے البتہ ان کا خیال ہے کہ غیر شعوری یادیں ذہنوں میں محفوظ رہ سکتی ہیں۔ لہٰذا موجودہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ محمود غزنوی، شہاب الدین غوری، علاؤ الدین خلجی یا دوسروں نے جو کچھ کیا۔ اس پر وقتاً فوقتاً اظہار افسوس کرتے رہیں۔ ڈاکٹر کاٹجو نے ایک حل اور بھی پیش کیا ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کو ان غلطیوں کی تلافی کیلئے بھی تیار رہنا چاہیئے اور اسکی یہ صورت ہے کہ ہندوؤں سے روابط بہتر کرنے کیلئے وہ اس پر اعتراض نہ کریں کہ ہندو کسی مسجد کو اس خیال سے مندر میں تبدیل کرلیں کہ وہ مسجد کسی زمانے میں مندر ہوگی۔ مضمون کے آخر میں مندرجہ

ذیل پانچ اصول وضع کئے گئے ہیں جن سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات بہتر ہو سکتے ہیں۔

۱) تمام مذاہب کی یکساں عزت کی جائے اور برتری اور کہتری کا خیال ترک کر دیا جائے۔ (یعنی مسلمان اپنے مذہب کو ہندومت سے بہتر نہ سمجھیں)

۲) بغیر رضامندی کے جو ترک مذہب ہوا ہو اس کی مذمت کی جائے۔ (اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسوقت جن مسلمانوں کو جبراً ہندو بنایا جا رہا ہے اس کی مذمت کی جائے بلکہ جو ہندو صدیوں پہلے مسلمان ہوئے تھے ان کی مذمت کی جائے۔)

۳) ہر پرستش گاہ کا احترام کیا جائے اور اگر کسی کی ملکیت ضائع ہو گئی ہے تو اسے بحال کیا جائے۔ (گویا مسجدوں کو مندروں میں تبدیل کیا جائے)

۴) موجودہ نسل کو گذشتہ بے حرمتی اور تباہی کا ذمہ دار نہیں سمجھنا چاہیئے لیکن اس کی حمایت میں کچھ نہیں کہا جانا چاہیئے اور اگر مندر پر بنی ہوئی مسجد شکستہ ہو جائے تو اسے ہندوؤں کے حوالے کر دیا جائے۔

۵) مسجد کے سامنے باجے کے سوال کو اعلیٰ اصولوں کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔

مضمون میں ایک جگہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ دستوری تحفظات سے کچھ نہیں بنتا، نہ ان سے ذہنیت بدل جاتی ہے۔ نیز فرقہ وارانہ ہم آہنگی دستوری مساوات سے مختلف ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو مساوات کا جو کاغذی تحفظ دستور ہند میں دیا گیا ہے وہ عملاً بیکار ہے کیونکہ اس سے ہندو کی قلب ماہیت نہیں ہو سکے گی اور وہ مسلمان کو معاف نہیں کرے گا۔[1]

یہ مضمون حکومت ہند کی طرف سے شائع ہوا ہے اور ایک وزیر کا لکھا ہوا ہے۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ہندو مسلمانوں سے کیا سلوک کرنا چاہتے ہیں۔ سب سے پہلے انہوں نے لاکھوں کی تعداد میں مسلمانوں کو بیدریغ قتل کیا۔ پھر ان کی جائدادوں پر غاصبانہ قبضہ کر کے اور انھیں مال و املاک سے محروم کر کے پاکستان کی طرف بھگانا شروع کیا۔ اس سے بھی مسلمان ختم نہ ہوئے تو اب نہ محض انھیں جبراً ہندو بنایا جا رہا ہے اور انکی مسجدوں کو مندروں میں تبدیل کیا جا رہا ہے بلکہ انھیں مجبور کیا جا رہا ہے کہ اسے برضا و رغبت قبول کریں بلکہ اس میں ہندوؤں کا ہاتھ بٹائیں اور خود اپنی تاریخ کی مذمت کریں اس کے لئے اظہار ندامت کریں اور اپنی عبادت گاہوں حتیٰ کہ اپنے آپ کو ہندوؤں کے حوالے کر دیں۔ مسلمانوں کے ساتھ یہ سلوک کرنے والا اور اس ذہنیت کا مالک ہندوستان مسلمان ممالک سے دوستی کا دم بھرتا ہے اور مسلمان ممالک ہیں کہ اس کی باتوں پر آمنا و صدقنا کہتے ہیں۔

پاکستان دشمنی

بہرحال مسلمانوں سے یہ سلوک بھی پاکستان دشمنی کی بدولت ہے کیونکہ اگر اس طرح مسلمانوں کا کانٹا ہندوستان کے دل سے نکل گیا تو ہندو سلطنت کے خواب کی تعبیر آسان ہو جائیگی اور اگر انھوں نے اپنے آپ کو ہندو کے رحم و کرم پر نہ چھوڑا اور ہندوستان ترک کر کے پاکستان چلے گئے تو پاکستان کیلئے چند در چند مشکلات کا سامنا ہوگا۔ جہاں تک پاکستان سے تنازعات کا تعلق ہے ان میں ہندوستان کا رویہ بدستور سابق غیر مصالحانہ ہے۔ دریائی پانی کی تقسیم کا مسئلہ جوں کا توں پڑا ہے۔ جب بھاکرہ نہر کھولی گئی تھی اور ہندوستان نے یہ فرض کر لیا تھا کہ عالمی بنک کے توسط سے ہونیوالے مذاکرات ناکام ہو گئے ہیں تو پاکستان کی طرف سے اعلان کیا گیا تھا کہ مذاکرات از سر نو جلد شروع ہو جائیں گے۔ اس کیلئے پاکستان نے مشروط طور پر عالمی بنک کی تجاویز کو منظور بھی کر لیا تاکہ مذاکرات کے شروع کرنے کے خلاف ہندوستان کا یہ اعتراض بھی دور ہو جائے کہ پاکستان نے تجاویز کو نامنظور کر رکھا ہے۔ اس کے باوجود

---

[1] جو لوگ کہا کرتے ہیں کہ پاکستان بنا کر کیا لے لیا ہے انھیں اس پر غور کرنا چاہیئے کہ اگر وہ انگریز کے چلے جانے کے بعد ہندوستان میں رہتے اور ان کی الگ مملکت نہ ہوتی تو آج ان کا ہندوستان میں کیا حشر ہوتا۔

مذاکرات ابھی تک شروع نہیں ہوئے۔ عالمی بنک کی دونوں حکومتوں سے مراسلت بھی رہی اور اسکے نمائندے ہندوستان اور پاکستان کا دورہ کرکے بھی گئے ہیں لیکن ایسے معلوم ہوتا ہے کہ بنک کسی مفاہمت کی ذمہ داری نہیں لینا چاہتا اور معاملہ ایک حد تک کھٹائی میں پڑ گیا ہے کشمیر کا مسئلہ بھی اسی طرح کھٹائی میں پڑا ہوا ہے پنڈت نہرو نے بڑی چالاکی سے سکوکوئی ڈیڑھ سال اور لٹکائے رکھا۔ حال ہی میں وزرائے اعظم پاکستان و ہندوستان کی جو مراسلت شائع ہوئی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ پنڈت نہرو کسی مفاہمت کیلئے تیار ہی نہیں تھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اب کشمیر کا کیا ہوگا؟ یوں تو ایک عرصہ سے واضح تھا کہ ہندوستان نے براہ راست مذاکرات کو بیکار بنا دیا ہے اور اب مزید مذاکرات لاحاصل ہیں لیکن اس کے باوجود بات کھینچی گئی لیکن حکومت پاکستان یہ تصفیہ نہ کر سکی کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔ اب جبکہ مذاکرات بالکلیہ ٹوٹ چکے ہیں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ کشمیر کو پھر سے سلامتی کونسل میں پیش کیا جائے۔ تعجب ہے کہ اس سادہ سے اقدام کیلئے اتنا لیت ولعل کیوں کیا گیا۔ جہاں تک اقوام متحدہ کے حلقوں کا تعلق ہے وہاں اس فیصلے کا استقبال سرد مہری سے کیا گیا ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ایک ایسا سوال واپس آرہا ہے جس کا پانچ سال سے کچھ حل نہیں نکل سکا۔ اس میں اب کون دلچسپی لیگا اور کس حد تک؟ اس کا اندازہ مسئلہ پیش ہونے پر ہی کیا جا سکے گا ——— لیکن

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

ارباب سیاست پاکستان کو اسکی فرصت کہاں کہ وہ سوچیں کہ ہندوستان دریاؤں کے رخ کدھر موڑ رہا ہے، کشمیر میں کس طرح پنجے گاڑ رہا ہے اور پاکستان کو کس طرح مفلوج کر رہا ہے؟ ایک طرف پاکستان میں قدرت نے تباہی مچائی۔ پہلے بنگال میں بے پناہ سیلاب آئے جو بے تحاشا بارشوں کا نتیجہ تھے۔ یہ غنیمت ہے کہ ترکی اور امریکہ نے بروقت ضروری امداد بھیجی جس سے صورت حال کا بہت حد تک مقابلہ کیا گیا لیکن اس کے باوجود نقصان بہت سوا ہے جس کا مناسب اندازہ ابھی ناممکن ہے۔ بنگال کے سیلاب تھمے ہی تھے کہ پنجاب کو بارش نے آگھیرا۔ اکثر بڑے بڑے شہر اور ہزاروں گاؤں دیکھتے دیکھتے زیر آب ہوگئے۔ لاکھوں بے خانماں ہوئے۔ گو پنجابیوں کی جان، مال اور فصل کے نقصان کا اندازہ نہیں لگایا جا سکا لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ نقصان بے پناہ ہوگا۔ ادھر قدرت نے یہ تباہی مچا رکھی ہے اور ادھر لیڈرانِ قوم ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے اور رہی سہی کسر پوری کرنے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

مسلمان کدھر جائے! ملک کے سامنے سب سے اہم سوال تسوید دستور پاکستان ہے سات سال تک اسے بہ لطائف الحیل ٹالا جاتا رہا۔ اسکی وجہ ظاہر تھی۔ تحریک پاکستان میں نعرے یہ لگائے گئے تھے کہ پاکستان اسلامی نظام معاشرت کی تجربہ گاہ ہوگا لیکن جب اسلامی نظام کی تشکیل کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ نہ ہمارے ہاں دستور کے سمجھنے والے ہیں نہ اسلام کو۔ اس سے ایک عجیب ہڑبونگ مچی۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ یہ ہڑبونگ باہمی تبادلہ خیالات سے ایک متفقہ راہ تلاش کرنے کا پیش خیمہ بن سکتی تھی لیکن یہ محض انتشار ذہن و پراگندگی فکر کا آئینہ رہی۔ ادھر ملانے اسلامی دستور کے پردے میں حکومت پر قبضہ کرنے کی بازی لگائی، ادھر ارباب سیاست نے اپنے استحکام و دوام کی ٹھانی۔ اس جنگ زرگری میں قوم کی خوب مٹی پلید ہوئی۔ نظم و نسق حکومت عدم توجہی اور نفسا نفسی میں ازحد فاسد ہوگیا اور دستور کی تشکیل میں غیر معمولی تاخیر پیدا ہوگئی جس سے نئے فتنے واقع ہوگئے۔ ان فتنوں کا علاج شروع ہوا تو فتنے در فتنے ابھرے۔ چار و ناچار ۱۹۵۲ء کی بنیادی اصولوں کی سفارشات میں کچھ تبدیلیاں کرکے اسے منظور کر لیا گیا۔ یہ آئین جیسا کچھ تھا اس سے کہیں زیادہ قابل ذکر وہ ذہنیت ہے جس نے اسے مکمل کیا۔ نئے آئین کے نفاذ کے بعد لازماً ایک عبوری دور آنا تھا جس میں اس آئین کے مطابق انتخابات ہوتے اور ان کے مطابق نئی حکومتیں تشکیل ہوتیں۔ اب یہ تگ و دو شروع ہوئی کہ عبوری دور میں طاقت کس کے ہاتھ ہوگی۔ اس تگ و دو نے عجیب رنگ اختیار کیا کیونکہ کئی متضاد عناصر جمع ہوگئے تھے تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ مرکز کی بنگالی قیادت اپنے صوبے میں شکست کھا چکی ہے۔ اس شکست کی کیفیت یہ ہے کہ انکی نام نہاد

مسلم لیگ اس صوبے میں ختم ہو چکی ہے۔ پہلے تو خیال تھا کہ ڈھاکہ سے جو ریلا آیا ہے اس میں یہ قیادت بہہ جائیگی لیکن پنجاب کی مدد سے مرکز کو بچا لیا گیا۔ اب جو مسلم لیگی بنگالیوں کو ہوش آیا تو انھوں نے مختلف نقشہ دیکھا۔ بنگال میں ان کی بحالی خارج از بحث تھی۔ ان بیچاروں کو اپنے گھروں میں بھی جانا دوبھر ہوگیا اور وہ کراچی کے ہی ہو کے رہ گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ یونائیٹڈ فرنٹ سے انتقام لیا جا سکتا ہے بشرطیکہ مرکز مضبوط ہو اور وہ مرکز پر مسلط ہیں۔ اس پر بنگالی ذہنیت میں انقلاب آیا۔ وہ اس سے پیشتر کمزور مرکز اور زیادہ صوبائی خود مختاری کے قائل تھے۔ اب انھوں نے ایک طرف بنگال کو اختیارات دلوانے شروع کئے تاکہ یونائیٹڈ فرنٹ کے جو مطالبات تھے انھیں وہ پورا کر کے صوبے میں ہر دلعزیز ہو جائیں۔ دوسری طرف انھوں نے مرکز پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ مرکز پر قبضے کیلئے ضروری ہو گیا کہ مغربی پاکستان میں بھی ان کا اثر ہو۔ اس کیلئے انھوں نے سوچا کہ مسلم لیگ کام آ سکتی ہے۔ چنانچہ اب کوشش کی جا رہی ہے کہ مسلم لیگ کا احیا کیا جائے اور اس کے ذریعہ مغربی پاکستان پر قبضہ کیا جائے۔ اسی لئے محترمہ مس فاطمہ جناح کو صدارت کیلئے آگے بڑھایا جا رہا ہے تاکہ ان کے نام کا فائدہ اٹھایا جا سکے۔ واضح رہے کہ یہ حضرات اس سے پیشتر محترمہ کی صدارت کے حق میں نہیں تھے۔ اب مسلم لیگ کنونشن اسی نیت سے دیکھا جا رہا ہے۔ [ہماری دعا ہے کہ محترمہ فاطمہ جناح صاحبہ اس "دنگل" میں نہ ہی آئیں تو اچھا ہے۔ ورنہ ہمیں خطرہ ہے کہ ان کا جو بزرگانہ وقار اس وقت تک قائم ہے وہ بھی ختم نہ ہو جائے۔]

مغربی پاکستان کی بدیہی کمزوری کئی وحدتوں کا وجود تھا۔ اس کا فائدہ اٹھایا گیا۔ پنجاب میں دولتانہ کی پیٹھ ٹھونکی گئی کہ وہ ملک فیروز خاں نون کی وزارت کو مبتلائے کشمکش رکھیں کیونکہ ملک صاحب کبھی کبھی بنگالی آمریت کے خلاف بات کر جاتے ہیں۔ سندھ میں انھوں نے پیرزادہ عبدالستار کی پیٹھ ٹھونکی۔ پیرزادہ صاحب کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اسمبلی کے ارکان کی اکثریت ان کے خلاف ہے اسی لئے وہ اس کا اجلاس تک منعقد نہیں کراتے لیکن انھیں سندھ کا نجات دہندہ اور ہیرو بنا دیا گیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ بنگالی اکثریت کے زور پر ہی وزیر اعلیٰ رہ سکتے ہیں۔ لہذا جس کا کھائیں اس کا گائیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب وحدتِ مغرب کی تجویز پیش ہوئی تو اسے بنگالی مسلم لیگیوں نے ناکام بنا دیا۔ ایک یونٹ کے جہاں اور فوائد ہیں وہاں ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ اس سے مشرق و مغرب میں توازن قائم ہو جاتا ہے۔ چونکہ دونوں طرف ایک ایک یونٹ ہو گا اسلئے ایک دوسرے کی طرف سے تفرقہ اندازانہ مداخلت یا تفوق کا سوال ہی پیدا نہیں ہو گا۔ بنگالی مسلم لیگی جو مرکز کے ذریعہ مغربی پاکستان پر بھی قبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے انھوں نے اس تجویز کو ناکام بنا دیا۔ ملک فیروز خاں نون کے بیان کے مطابق انھوں نے ملک صاحب کو کہا کہ اگر وہ وحدت کی تجویز چھوڑ کر ذیلی وفاق — مغربی پاکستان کے ذیلی فیڈریشن — کا مطالبہ کریں تو اسے مان لیا جائیگا۔ ملک صاحب کے کہنے کے مطابق انھوں نے اپنا مطالبہ بدل دیا لیکن اسے بھی منظور نہیں کیا گیا۔ اس سلسلہ میں یہ قابلِ ذکر ہے کہ کچھ عرصہ پیشتر دستور یہ میں محمد علی صاحب وزیر اعظم نے کہا تھا کہ اگر ان کا بس چلے تو وہ مغربی پاکستان کو ایک یونٹ بنا دیں۔ اس سے نتیجہ نکالا جا سکتا تھا کہ وزیر اعظم اپنا زور اس پر صرف کریں گے کہ یہ علاقہ ایک وحدت میں منسلک ہو جائے لیکن ایسا نہیں ہوا۔

شکست کا انتقام!

جس طریق سے لسانی فارمولا منظور کیا گیا تھا (ملاحظہ ہو طلوع اسلام بابت جون ۱۹۵۴) اور اس کے بعد جس انداز سے وحدتِ مغرب کو ناکام بنایا گیا اس سے یہ دلخراش حقیقت ابھر کر سامنے آئی کہ بنگال کے شکست خوردہ مسلم لیگی لیڈر مشرق و مغرب سے اپنی شکست کا انتقام لے رہے ہیں اور وہ جذبۂ انتقام سے اس حد تک مغلوب ہو چکے ہیں کہ انھیں اسکی کچھ فکر نہیں کہ ملک کا کیا ہو گا۔ یہ تماشا پاکستان میں ہی ہو سکتا تھا کہ جو پارٹی مشرق میں شکست کھا چکی ہو اور مغرب میں اسکو منہ نہ لگایا جاتا ہو وہ مرکز میں بیٹھ کر جو جی میں آئے کرے۔ اس کا بدترین مظاہرہ

ستمبر کے تیسرے ہفتے میں ہوا۔ بنگال کے متعلق مشہور ہوا کہ کئی مسلم لیگی حضرات کے خلاف پروڈکے مطابق مقدمات تیار کئے جا رہے ہیں۔ پہلے تو اندر اندر اس کو رفع کرنے کی کوشش کی گئی۔ حقیقت کچھ بھی ہو، ان کوششوں سے وزیر اعظم تک کا نام منسوب کیا گیا ــــ جب ایسا نہ ہو سکا تو اس بانس ہی کو اکھاڑ پھینکا گیا جس سے بانسری بنتی اور بجتی تھی۔ مسلم لیگ اسمبلی پارٹی نے ایک دن فیصلہ کیا کہ پروڈا کو ختم ہونا چاہئے۔ دوسرے دن پروڈا ختم تھا۔ اب وہ تمام لیڈر بری ہو گئے جو پروڈا کے سلسلے میں جی رہے تھے۔ بحث کے دوران میں یہ سوال پیدا ہوا کہ جب اس قانون کو ختم کرنا ہے تو کیوں نہ ان کو بھی بری کر دیا جائے جو اس کے ماتحت سزا بھگت رہے ہیں۔ لیکن اگر اس سے ان کے دوست دولتانہ صاحب بری ہو سکتے تھے تو مسٹر کھوڑو اور حمید الحق چودھری بھی بچ جاتے تھے۔ لہٰذا یہی فیصلہ ہوا کہ تنسیخ کا نفاذ پہلے سے نہ ہو۔

یہ کچھ کرنے کے بعد لازماً یہ ڈر پیدا ہونا چاہئے تھا کہ مبادا اپریل ۱۹۵۳ء کی تاریخ اپنے آپ کو دہرا نہ دے اور یہ وزارت بھی گورنر جنرل کے ہاتھوں برخواست نہ ہو جائے۔ چنانچہ اس کا مداوا یہ سوچا گیا کہ گورنر جنرل کے وہ اختیارات ہی منسوخ کر دیئے جائیں جن کے مطابق وہ وزارت برطرف کر سکتے ہیں۔ اس کیلئے ۲۰ ستمبر کی شام کو مسٹر گذدر نے ایک بل کا نوٹس دیا۔ چھ بجے شام ہدایت کار کمیٹی کا اجلاس ہوا اور اس نے سارا نظام الاوقات درہم برہم کر کے اس شق کو سب سے اوپر کر دیا۔ سات بجے غیر معمولی گزٹ میں یہ بل شائع ہو گیا۔ اتفاق سے دوسرے روز مجلس دستور ساز کے اجلاس کی تاریخ نہیں تھی بلکہ دس بجے مقننہ کو جمع ہونا تھا۔ راتوں رات ارکان دستوریہ کو اطلاعیں بھیجی گئیں کہ دوسرے دن عام وقت دس بجے کی بجائے ۹ بجے مجلس دستور ساز کا اجلاس ہوگا۔ کئی ارکان کو یہ اطلاع بروقت نہیں مل سکی (اور یہی مقصود تھا) دوسرے روز ۹ بجے مجلس دستور ساز کا اجلاس منعقد ہوا اور گورنر صاحب کا بل دس منٹ کے اندر اندر قانون بن گیا۔ اس پر کوئی بحث نہیں ہوئی اور اجلاس میں حاضری کم سے کم تھی۔ یہ سوال کہ گورنر جنرل کے اختیارات کیا ہوں، ایک علیحدہ بحث ہے۔ اصل سوال تو یہ ہے کہ اگر ان اختیارات کی تحدید ضروری تھی تو اس کیلئے قانون پاس کرنے کا عام طریقہ کیوں نہیں استعمال کیا گیا؟ محض اسلئے کہ ایک دن کی تاخیر بھی خطرناک سمجھی گئی؟ اب تمام اختیارات وزیر اعظم کے سپرد کر دیئے گئے ہیں۔ انھیں گورنر جنرل ہٹا نہیں سکتے۔ وزیر اعظم صاحب وزیروں کو جب چاہیں بدل سکتے ہیں۔ انھیں کسی وزیر کو بس یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ آپ فلاں تاریخ کے بعد وزیر نہیں رہیں گے۔ مقررہ تاریخ کے بعد وہ وزیر خود بخود وزیر نہیں رہیگا۔

اب اس عبوری حکومت کے زیر نگرانی دستور نافذ ہوگا اور نئے انتخابات عمل میں لائے جائیں گے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انتخابات کس قسم کے ہونگے اور ان کے نتائج کیا ہونگے۔

آئین کے خلاف احتجاج

ان فیصلوں سے صورت حال یہ ہو گئی ہے کہ مجلس دستور ساز خود مختار ہے اسے کوئی توڑ نہیں سکتا۔ مرکزی کابینہ کو گورنر جنرل برخواست کر سکتا تھا لیکن وہ اختیار سلب کر لیا گیا ہے۔ گویا مرکز کی بنگالی مسلم لیگی قیادت نے اپنے آپ کو دونوں طرف سے محفوظ کر لیا ہے۔ لیکن کیا اس کا کوئی مداوا نہیں رہا۔ یہ صحیح ہے کہ مجلس دستور ساز آئینی اعتبار سے خود مختار ہے لیکن آئینی اعتبار سے اسی ملک کا نمائندہ اور قوم کی خواہشات کا پابند ہونا چاہئے۔ گویا آخری اختیار قوم کو ہے نہ کہ کسی مقررہ کردہ جماعت کو۔ لہٰذا اگر قوم ہمت کرے تو اس بھان متی کے کنبے کو ان کے خود ساختہ تحفظات کے باوصف آئینی طور پر توڑا جا سکتا ہے۔ اسوقت ملک میں اچھی خاصی تحریک شروع ہو گئی ہے کہ ان شکست خوردہ لیڈروں کے مرتب کردہ دستور کو مسترد کر دیا جائے۔ بنگال کے یونائٹڈ فرنٹ والے تو اسکے مخالف تھے ہی۔ حال ہی میں مسٹر سہروردی نے زیورچ سے ایک بیان بغرض اشاعت دیا ہے جس میں اسمبلی توڑ دو کا مطالبہ دہرایا ہے۔ اسکی از سر نو ترتیب کیلئے یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ تمام صوبائی اسمبلیاں

اپنے نمائندے منتخب کرکے بھیجیں۔ سندھ کے مسٹر کھوڑو بھی دستور کی مخالفت کا اعلان کر چکے ہیں۔ یہ مواد اندر ہی اندر پک رہا ہے۔ ملت پر مایوسی چھا چکی ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کل کو کن حالات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ جیسا کہ معلوم ہے سیاسی اعتبار سے اہم ترین مسئلہ یہی ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں توازن پیدا کیا جائے۔ پنجاب —— اس کے لیڈر معتمد نہیں، اس کے باوصف —— اسی طرف جاتا نظر آتا ہے کہ یونائٹڈ فرنٹ سے مفاہمت کی جائے اور مجوزہ آئین کو مسترد کرکے اس کی بجائے مناسب فارمولا مرتب کیا جائے یونائٹڈ فرنٹ کا انداز بھی یہی معلوم ہوتا ہے تازہ بیان میں مسٹر سہروردی نے ایک حد تک کہہ بھی دیا کہ اگر مغربی پاکستان والے اپنے لئے کوئی منصوبہ تیار کریں گے تو انھیں اس کے ماننے میں کوئی تامل نہیں ہوگا لہذا اگر پنجاب اور بنگال مغربی پاکستان کی وحدت پر اتفاق کرلیں تو مطلوبہ توازن پیدا ہو سکے گا۔ بحالات موجودہ اس سے بہتر توقع عبث ہے کیونکہ جہاں تک اسلامی آئین کی تسوید کا تعلق ہے وہ نہ ایک قیادت کے بس کا روگ نہ دوسری کا۔

طلوع اسلام کو نہ مسلم لیگ سے کچھ تعلق ہے نہ یونائٹڈ فرنٹ سے کوئی واسطہ۔ اس کے نزدیک نہ مشرقی خطہ بیگانہ ہے نہ مغربی خطہ یگانہ۔ وہ نہ برسر اقتدار طبقہ کے حق میں ہے نہ اقتدار کے طالب حلقہ کی تائید میں۔ اس کی ان مسائل سے دلچسپی کی وجہ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ پاکستان ایک ایسی سرزمین ہے جس میں وہ خدا کے قانون کے نفاذ کا امکان سمجھتا ہے لہذا اس کے نزدیک اس سرزمین کا تحفظ بنیادی سوال ہے اور اس کے بعد اس میں خدا کے قانون کا نفاذ۔ جس طریق سے یہ مقاصد حاصل ہوں وہ اس کے نزدیک مستحسن ہیں اور جن کاروائیوں سے ان مقاصد پر زد پڑتی ہو وہ اس کے عقیدہ میں اس قابل کہ ان کی سخت مخالفت اور مذمت کی جائے۔ طلوع اسلام کے نزدیک ملک کی موجودہ کشمکش کا حل یہ ہے کہ مشرقی اور مغربی خطوں کو زیادہ سے زیادہ با اختیار بنا دیا جائے۔ چاہے کانفیڈریسی کے ذریعے اور چاہے جداگانہ خود مختار مملکتوں کی شکل میں۔ اس کے بعد ان میں بین الملی معاہدات کی رو سے اتحاد اور مواخات کے روابط پیدا کرلئے جائیں۔ مغربی پاکستان کو ایک وحدت بنا دیا جائے۔ تمام پارٹیوں کو قانوناً ختم کر دیا جائے (مع مسلم لیگ کے) اور ملک میں قرآن کا معاشی نظام رائج کر دیا جائے جس کی رو سے رزق کے سرچشمے کسی کی انفرادی ملکیت میں نہیں رہتے بلکہ ملت کی مشترکہ تحویل میں رہتے ہیں اور مملکت کے تمام افراد کی ضروریات زندگی کی کفیل خود مملکت بن جاتی ہے۔ اس کے سوا ہماری مشکلات کا کوئی حل نہیں لیکن اس کیلئے ایک بلند اقدام کی ضرورت ہے۔ یعنی یہ کہ (جیسا کہ ہم نے سال گذشتہ لکھا تھا) موجودہ مجلس آئین ساز کو ختم کرکے اس کے نام نہاد آئین کو کالعدم قرار دیا جائے اور ملک کے بہترین نمائندوں کے ذریعے از سر نو تدوین آئین کی کوشش کی جائے۔ یہ قدم فی الواقعہ بہت بڑا قدم ہے۔ لیکن چہ عجب کہ ہمارے جس گورنر جنرل نے ناظم الدین وزارت کی برطرفی کیلئے ایسا محکم اور عزیمت مندانہ قدم اٹھا کر ملک کو اطمینان کا سانس دلایا تھا وہ پھر اس عزم بلند سے کام لیکر ایک قدم اور بھی اٹھا دے اور اس طرح ملت کیلئے اس کی بازآفرینی کا ایک موقعہ اور بہم پہنچا دے۔ اگر وہ ایسا کردیں تو اس سے وہ فی الواقعہ اپنے آپ کو پاکستان کا نجات دہندہ ثابت کردیں گے۔

یہ ہیں اسوقت کے حالات جب یہ سطور حوالہ قلم کی جارہی ہیں۔ جسوقت یہی سطور قارئین کی نظروں سے گذرینگی معلوم اسوقت کیا حالات ہوں گے۔ بہر حال ہمیں بہتری ہی کی امید رکھنی چاہیے۔ وبید اللہ التوفیق۔

ہمارا اور آپ کا مشترکہ مفاد

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے طلوعِ اسلام نے آج تک نہ کسی سے مالی مدد مانگی ہے، نہ اب مانگ رہا ہے۔ البتہ اس کی ایک اسکیم ہے جس کی رو سے آپ اسے ایک پیسہ بھی مفت نہیں دیتے لیکن اسے قرآنی لٹریچر کی اشاعت میں بہت سہولت ہو جاتی ہے۔ اسکیم یہ ہے کہ اگر آپ ایک سو روپیہ (یکمشت یا چار مساوی ماہانہ قسطوں میں) ادا کر دیں تو آپ کا حساب کھول لیا جائے اور اس حساب میں ہم آپ کو رسالہ طلوع اسلام اور اس کی شائع کردہ کتابوں میں سے جو بھی آپ کو مطلوب ہوں بھیجتے چلے جائیں گے تا آنکہ آپ کا ایک سو روپیہ پورا ہو جائے۔ اس کے بعد آپ پھر اسی طرح پیشگی روپیہ جمع کرا سکتے ہیں۔ اگر ہم کسی وجہ سے اس سلسلہ کو جاری نہ رکھ سکیں تو آپ کا بقایا روپیہ آپ کو واپس کر دیا جائے گا۔

یہ اسکیم قریب ایک سال سے جاری ہے اور اس عرصہ میں ہم ایک درجن سے زائد کتابیں شائع کر چکے ہیں۔ ماہ جولائی ۱۹۵۴ء تک پیشگی خریداران کی تعداد ۲۳۵ تک پہنچ گئی تھی مگر اب اس کی رفتار بہت ہی سست پڑ گئی ہے اس کی طرف ناظرین کو خاص طور پر متوجہ ہونے کی ضرورت ہے۔ ایک درجن کے قریب کتابیں شائع ہونے کے لئے رکھی ہوئی ہیں جن میں "قرآنی نظامِ ربوبیت" اور معارف القرآن کی سابقہ جلدیں جو اب نایاب ہیں نیز معارف القرآن کی پانچویں جلد جیسی ضخیم کتابیں بھی شامل ہیں۔ آپ خود ہی غور فرمائیے کہ اس سلسلہ میں آپ کا کیا فرض ہے۔

ایک خصوصی رعایت

اس سلسلہ کو آگے بڑھانے اور ناظرین کی اس میں دلچسپی بڑھانے کیلئے یہ طے کیا گیا ہے کہ آئندہ سے پیشگی خریداران کے لئے ان کی مطلوبہ کتابوں پر محصول ڈاک بذمہ ادارہ ہوگا یعنی ان کو تمام مطلوبہ کتابیں اصل قیمت پر بلا ادائیگی محصول ڈاک اپنے گھر پر مل جایا کریں گی۔

اگر آپ ابھی تک "پیشگی خریداران" کی اسکیم میں شامل نہیں ہوئے تو اس پر غور فرما لیجئے کہ اس اسکیم کی رو سے آپ ایک پیسہ بھی زائد نہیں دیں گے اور قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں ہمیں بہت آسانی ہو جائے گی۔ بات صرف اتنی ہے کہ آپ قیمت پیشگی دیتے ہیں۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس ۷۳۱۳ کراچی

معارف القرآن

کی چار جلدیں شائع ہوچکی ہیں لیکن ان میں سے پہلی تین جلدیں مدت سے نایاب ہیں۔ قرآنی ذوق رکھنے والوں کے پیہم تقاضوں کے پیش نظر جناب پرویز نے ان جلدوں پر نظر ثانی کی ہے اور (علاوہ دوسری تبدیلیوں کے) ان کی ترتیب کو بھی بدل دیا ہے۔ چنانچہ

معارف القرآن جلد دوم

اب اس سلسلہ کی پہلی کڑی قرار دی گئی ہے اور اس کا نام رکھا گیا ہے:

ابلیس و آدم

اس میں انسانی تخلیق (نظریۂ ارتقاء) قصۂ آدم۔ ابلیس، شیطان۔ جنات، ملائکہ۔ وحی اور رسالت کے متعلق مباحث شامل ہیں

ایسے اہم عنوانات۔ قرآن کی تعلیم۔ اور جناب پرویز کا قلم

آپ خود ہی اندازہ لگا لیجئے کہ کتاب کیا ہوگی!

یہ کتاب بڑی تقطیع (۲۲×۲۹/۸) کے ۳۷۶ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے جو ابھی پریس میں زیر طبع ہے امید ہے کہ بہت جلد شائع ہو جائے گی اور جس ترتیب سے فرمائشیں آئیں گی اسی ترتیب سے اس کی روانگی ہوگی لہٰذا اپنی فرمائش بہت جلد بھیجئے۔ **قیمت** مجلد مع گرد پوش آٹھ روپے۔ (علاوہ محصول ڈاک)

جن حضرات کا روپیہ ہمارے پاس جمع ہے ان میں سے وہی صاحب اطلاع دیں جنھیں یہ کتاب درکار نہ ہو۔ باقی سب کو کتاب از خود بھیجدی جائے گی۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳۔ کراچی

ناظرین سے اپیل

قرآنی فکر کو عام کرنے کے لئے طلوع اسلام کی توسیع اشاعت میں کوشش کرنا، نیز اپنے مقامی ایجنٹوں کو طلوع اسلام اور اس کے لٹریچر کی ایجنسی کے لئے راغب کرنا آپ کا فرض ہے۔

ادارۂ طلوع اسلام کی مطبوعات ایک نظر میں

معراجِ انسانیت ترجمانِ حقیقت جناب پرویز کا قلم اور سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام خود قرآن کے آئینے میں جو اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور نہایت کامیاب۔ ابتدا میں تقریباً دو سو صفحات پر دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر۔ پھر نادر عنوانات کے ماتحت سیرت حضور سرور کائنات جس میں دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں بڑے سائز کے قریب نو سو صفحات۔ کاغذ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ۔ جلد مضبوط و حسین۔ گردپوش مرصع و دیدہ زیب۔ ٹائٹل اور صبح بہار کے عنوانات منقش و رنگین۔ قیمت بیس روپے (علاوہ محصولڈاک)

نوادرات علامہ حافظ محمد اسلم کے نادر مضامین کا قابل قدر مجموعہ۔ ضخامت ۴۰۰ صفحات۔ قیمت صرف چار روپے

اسلامی نظام دورِ حاضرہ کی ایک بلند پایہ کتاب جس میں بتایا گیا ہے کہ ایک اسلامی مملکت کے نظام اور آئین کے بنیادی اصول کیا ہیں۔ وہ نظام آج کس طرح قائم ہو سکتا ہے۔ اس میں محترم پرویز صاحب اور علامہ اسلم صاحب جیراجپوری کے وہ مقالات شامل ہیں جنہوں نے قوم کے سنجیدہ طبقے کے سامنے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں ضخامت ۱۲۰ صفحات مجلد مع گردپوش۔ قیمت دو روپے

قرآنی دستورِ پاکستان آئینی جدوجہد کے سلسلے میں ادارہ طلوع اسلام کی پیشکش قرآن کی روشنی میں مسودات قرارداد مقاصد، بنیادی اصول حقوق جو حکومت کے اعلان کے جواب میں بھیجے گئے ساتھ ہی حکومت کی جانب سے پاس کردہ قرارداد مقاصد اور بنیادی اصولوں کی پہلی رپورٹ پر قرآن کی روشنی میں تنقید۔ مولوی صاحبان کے بائیس نکات کا تجزیہ، اسلامی جماعت کے دستوری سفارشات پر تبصرہ۔ ضخامت ۲۲۴ صفحات مجلد مع گردپوش دو روپے آٹھ آنے۔

اسبابِ زوالِ امت (پرویز) دورِ حاضرہ کی انقلاب آفریں کتاب۔ مختصر مگر ہماری ہزار سالہ تاریخ کا نچوڑ جس نے قوم کے سنجیدہ تعلیم یافتہ طبقہ کے قلب و نگاہ میں انقلاب پیدا کر دیا۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ زندگی میں پہلی مرتبہ صحیح طور پر بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور اسکا علاج کیا؟ ضخامت ۱۵۰ صفحات مجلد طلائی گردپوش۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

سلیم کے نام خطوط محترم پرویز صاحب کے قلم سے ہمارے نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق جس قدر شکوک پیدا ہو گئے ہیں انکا نہایت شگفتہ، شاداب اور سائنٹفک انداز میں تسکین بخش جواب۔ عقائد و نظریات جیسے خشک اور نازک مسائل پر اس عمدگی سے بحث کی گئی ہے کہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ہم کسی خشک فلسفیانہ بحث کو پڑھ رہے ہیں۔ باتوں باتوں میں وہ دقیق اور معرکۃ الآرا مسائل حل کر کے رکھ دیئے گئے ہیں جنہیں ضخیم مجلدات میں بھی حل نہیں کیا جا سکا تھا۔ ضخامت بڑے سائز کے ۴۲۵ صفحات مجلد مع گردپوش قیمت چھ روپے۔

قرآنی فیصلے دورِ حاضرہ کی ایک اہم کوشش جس میں روزمرہ زندگی کے تقریباً ساٹھ اہم مسائل و معاملات کے متعلق قرآن کی روشنی میں بحث کی گئی ہے کہ ان مسائل اور معاملات میں قرآن پاک کا کیا فیصلہ ہے۔ یہ کتاب آپ کو دوسرے سہاروں سے بے نیاز کر دے گی ضخامت ۴۰۸ صفحات قیمت مجلد مع گردپوش چار روپے۔

جشن نامے بلند حقائق کا مجموعہ، درس عبرت و موعظت کا مرقع ایسے ایسے عنوانات جنہیں پڑھ کر بیک وقت آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں آنسو آجائیں۔ طنز اور تنقید کے ایسے گہرے نشتر، اثر و درد کے ایسے خونچکاں منظر شاید ہی کہیں مل سکیں۔ یہ کتاب ہمارے سات سالہ دورِ آزادی کی سسکتی ہوئی تاریخ ہے۔ ضخامت ۲۵۶ صفحات قیمت مجلد مع گردپوش دو روپے آٹھ آنے (علاوہ محصولڈاک)

مزاجِ شناسِ رسول: مفصل اشتہار ٹائیٹل کے دوسرے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔ قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت: " " " آخری صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔ قیمت دو روپے

مقام حدیث: " " " " قیمت جلد اول چار روپے۔ جلد دوم چار روپے

ادارۂ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس ۷۳۱۳۔ کراچی